سلسلۂ مطبوعات انجمن طیلسانین ۱۲

پریم چند

اور

اُن کی افسانہ نگاری

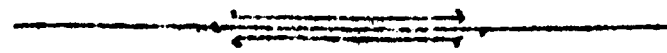
(از)

محمد اکبرالدین صدیقی، ام، اے (عثمانیہ)

دفتر انجمن طیلسانین عثمانیہ باغ عامہ حیدرآباد دکن فون ۲۵۵۳

فہرست

پیش لفظ



پیش لفظ

منشی پریم چند نے اپنے قصوں اور کہانیوں کے ذریعہ اُردو زبان کی جو قابل قدر خدمت انجام دی ہے اور اُردو ادب میں جو بیش قیمت اضافہ کیا ہے اس کا اقتضا تو یہ ہے کہ ان کے حالات اور تصانیف پر متعدد کتابیں اور مقالے لکھے جاتے۔ منشی جی نے ایک طویل عرصے تک تصنیف و تالیف کا کام کیا ہے اور ان کی ادبی زندگی کے مختلف دور ہیں اور مختلف تصورات اور مقاصد ان ادوار میں ان کے پیشِ نظر رہے ہیں اور یہ ان کی کتابوں سے ظاہر ہوتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ایک بلند مقصد جو شروع سے آخر تک ان کی ادبی زندگی میں نمایاں نظر آتا ہے وہ یہ ہے کہ اُردو کے افسانوی ادب میں ملکی اور مقامی رنگ کی جو افسوسناک کمی ہے وہ دُور کر دی جائے اور ہندوستان کے دیہات و قصبات کی زندگی (کہ اصلی ہندوستان یہی ہیں) پیش کی جائے تاکہ وہ حقیقی معنوں میں ہندوستانی ادب کہلایا جا سکے۔ وہ اپنی اس پُرخلوص کوشش میں ہر طرح کامیاب ہوئے اور بہت سے افسانہ لکھنے والے ان کی تحریرات سے متاثر ہو کر اس رنگ میں لکھ رہے ہیں۔ ان کی بدولت آج اُردو ادب میں ایسے افسانوں کی کمی نہیں جو ہر طرح ملکی اور عصری افسانے کہے جا سکتے ہیں۔ پریم چند کی سادہ اور عملی زندگی دیکھنے والے کے لیے اپنے اندر بہت دلکشی رکھتی ہے مگر ایک ایسے محسن اُردو پر اُردو میں بہت کم لکھا گیا ہے اور باوجود ان کی خاص و عام میں مقبولیت اور ہر دلعزیزی کے ان کی تصانیف پر کوئی قابلِ لحاظ تنقیدی کتاب نہیں لکھی گئی۔

مولوی اکبرالدین صاحب صدیقی نے غالباً پریم چند کی سادہ اور علمی زندگی اور خاص و عام میں ان کی مقبولیت سے متاثر ہو کر اپنے ام، اے کے مقالے کے لیے "پریم چند" کا انتخاب کیا ہے۔

لایق مقالہ نگار نے کافی تلاش اور جستجو سے پریم چند کے متعلق جگہ جگہ سے مواد فراہم کیا ہے اور خود ان تصانیف کا غائر مطالعہ کرکے ان کے موضوعات، اسلوب بیان اور ارتقائے فن پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ نیز اردو کے افسانہ نگاروں کو پریم چند نے کس حد تک متاثر کیا ہے اس کا بھی جائزہ لیا ہے۔ مقالہ نگار پریم چند کے مداح ضرور ہیں لیکن پرستار نہیں عام روش کے برخلاف انھوں نے پریم چند کا مطالعہ تقریظ نگار کی بجائے تنقید نگار کی حیثیت سے کیا ہے اور اس لیے یہ مقالہ ایک لائق قدر ادبی کوشش ہے اور اس موضوع پر کام کرنے والوں کے لیے بہت سے امور میں رہبری کرے گا۔

سٹی کالج حیدرآباد دکن
جنوری ۱۹۴۵ء

سید محمد
ام، اے (عثمانیہ)
لکچرار اردو

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پہلا باب ۔ پریم چند کی مقبولیت اور ان کے متعلق اردو میں ادب

ابتدائی کتابیں | ۱۹۰۹ء تک پریم چند سے بہت کم لوگ واقف تھے ۱۹۰۴ء میں جب کہ ان کا ناول (ہم خرما و ہم ثواب) شایع ہوا تو مصنف کی حیثیت سے ان کی ادبی زندگی شروع ہوئی ۔ اور وہ رفتہ رفتہ روشناس ہونے لگے ۔ ۱۹۰۹ء میں (سوز وطن) کی اشاعت اور اس پر پریم چند کے خدایان مجازی کا بگڑنا اور انھیں انتہائی حد تک پریشان کر دینا کچھ تو ان کی شہرت کا بھی باعث ہوا اور اُن کے خیالات پر بھی کافی اثر انداز ہوا (جلوۂ ایثار) کی اشاعت نے انھیں بہت زیادہ مشہور کر دیا حالانکہ اس سے پہلے وہ کچھ کہانیوں (ہم خرما و ہم ثواب) اور (روٹھی رانی) کے مصنف بن چکے تھے ۔ ابتدائی کہانیوں میں راجپوتوں کی شجاعت اور جانبازی کو بیان کیا گیا تھا اور چونکہ انھوں نے اپنے لیے ایک علٰحدہ میدان پیدا کر لیا اس لیے بڑی دلچسپی پیدا ہو گئی ۔ (جلوۂ ایثار) اور اس کی پیشرو کتابوں نے مہاتما گاندھی ۔ موتی لال نہرو ۔ اور لاجپت رائے کی تقریروں کا کام کیا اور وہ لوگوں کو ایک نئے طریقے سے اپنی طرف متوجہ کرنے میں کامیاب ہو گئے ۔

مقدمہ امتیاز علی تاج | ۱۹۲۵ء تک ان کی کہانیوں کی تعداد بھی کافی ہو چکی تھی اور لوگ اُن کے نام اور کام سے واقف ہو چکے تھے اس اثنا میں (پریم پچیسی) اور (پریم بتیسی) منصۂ شہود پر آ چکی تھیں ۔ موخرالذکر ۱۹۲۵ء میں شایع ہوئی اس کی طبع دوم پر امتیاز علی تاج نے مقدمہ لکھا ۔ یہ پریم چند کے ادبی کارناموں پر پہلی تنقید تھی اس میں انھوں نے پریم چند کے قصوں کی

خصوصیات پیش کی ہیں ان میں خاص کر عمیق مطالعہ فطرت۔ واقعات روزمرہ کا بیان اور انداز بیان کی سادگی کو بہت سراہا ہے اس کے علاوہ ان کی بے تکلف روش اور اس اثر کا بھی ذکر کیا ہے جو قاری پر مترتب ہوتا ہے۔ سدرشن کی (بہارستان) کے لیے پریم چند نے جو مقدمہ لکھا ہے اس میں سدرشن کی حسب ذیل خصوصیات بیان کی ہیں۔

۱۔ وہ جذبات کو بہت اپیل کرتے ہیں۔

۲۔ ہر ایک کہانی میں کوئی نہ کوئی حقیقت ضرور ہے اور جذبہ انسانی کے کسی نہ کسی پہلو پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

۳۔ لطافت بیان کا بھی کافی سرمایہ موجود ہے۔

۴۔ کہانی کے پلاٹ ڈرامیٹک ہیں۔

۵۔ افسانے اساسی جذبات پر قایم کیے گئے ہیں۔

۶۔ تاج صاحب نے پریم چند کی سدرشن کے لیے کہی ہوئی ان خصوصیات کو پریم چند پر منطبق کر دیا ہے۔

مغربی ممالک میں کسی مصنف کو ابھارنے اور چمکانے والے نقادانِ فن ہی ہوتے ہیں اس کی تقلید یہاں بھی ہے اس مقدمہ کی حیثیت مال کو کھرا بتلانے والے عطار کی تھی لیکن عطر نے خود اپنی بو کو اتنی شدت سے پھیلایا کہ عوام اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ دوسری چیز یہ ہے کہ زمانہ کو ناولوں سے زیادہ مختصر افسانوں کی ضرورت تھی اور پریم چند نے "چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی" کے مقولے پر عمل کیا اور زمانہ کا ساتھ دینے کے لیے اپنے افسانوں کے لیے ایک خاص تخیل قایم کر لیا۔ اور اس پر کاربند رہے۔ ان کی ترقی اور قبولیت کا راز صلاح الدین احمد مدیر ادبی دنیا کے الفاظ میں یوں ہے۔

"پریم چند خارجی عناصر سے متاثر نہیں تھے ان کے افسانوں کا ماحول اور ان کے کردار سراسر ہندوستانی ہیں۔ ۔۔۔۔ پریم چند ایک ہمہ گیر طبیعت لے کر آئے تھے اور انہوں نے

زندگی کو بہت سے زاویوں سے دیکھا گو اپنے عروج کے دنوں میں کچھ اصلاح پسند ہوگئے تھے اور ان کا یہ رجحان ان کے ناولوں سے بدرجہ غایت نمایاں ہے۔ اور اگرچہ بسا اوقات وہ کسی معاشرتی برائی یا اصلاحی مقصد کو مرکز بنا کر اس کے گرد اپنی کہانی کا جال بنتے تھے اور ان کا یہ اسلوب زمانۂ قبل از جنگ کے معاشرتی اور اقتصادی نظام اور اس دور کی قدروں سے خوب مطابقت رکھتا تھا۔ لیکن اس میں بھی کلام نہیں کہ آج کل کے نفسیاتی افسانے کی بنیاد بھی انھی نے رکھی اور افسانے میں کردار کی تعمیر کی اہمیت کو بھی سب سے پہلے انھوں نے ہی محسوس کیا۔" [1]

پروفیسر آل احمد سرور کا بھی خیال بالکل صحیح ہے وہ لکھتے ہیں۔

"بیسویں صدی کے نت نئے انقلابات اور پریم چند کے اثر نے افسانہ نگاری میں نت نئے رجحانات پیدا کر دیے اب افسانہ نگاری صرف تفریح نہ رہی وہ فریاد کی ایک لئے بن گئی۔" [2]

اس طرح انھوں نے افسانہ نگاری کو فریاد کی لئے بنا دیا اور روز بروز مقبول انام ہوتے گئے تاج صاحب کے مقدمہ نے لوگوں کی افسانہ خوانی کی آتش شوق کو بھڑکایا۔ اردو ادب میں یہ پہلی کوشش تھی کہ پریم چند کے کارناموں پر فنی نقطہ نگاہ سے تنقید کی گئی۔ پریم چند پروفیسر سروری کی نظر میں دنیائے افسانہ اور کردار اور افسانہ کا مرتبہ اپنے فن پر اردو زبان میں پہلی کتابیں ہونے کی حیثیت سے بیحد بلند ہے۔ پروفیسر سروری پریم چند کے متعلق فرماتے ہیں۔

"پریم چند پہلے قصہ نگار ہیں جنھوں نے مختصر قصوں کو اعلیٰ پایہ پر پہنچایا۔ اردو مختصر قصہ کے لیے انھوں نے وہی کام کیا جو شرر نے ناول یا اسٹی ون سن نے انگریزی مختصر قصہ کے لیے کیا۔ مگر شرر یا اسٹی ون سن کو ناول یا مختصر قصوں کا موجد نہیں تسلیم کیا جاتا۔ اسی طرح پریم چند بھی اردو مختصر قصہ نگاری کے موجد نہیں کہے جا سکتے۔ لیکن ان کو مختصر قصہ نگاری میں اختصاصی حیثیت حاصل ہوگئی ہے۔ ان کے قصے ہندوستانی زندگی کے

---

[1] ادبی دنیا جنوری ۴۳ء۔ [2] تنقیدی اشارے صفحہ ۲۳۔

پاکیزہ اور مانوس مرقعے پیش کرتے ہیں۔ ان کا حزنیہ قصہ ہمیشہ طربیہ سے زیادہ موثر ہوتا ہے۔ منشی پریم چند کے حزنیہ قصوں کے پڑھنے سے اثر تمام بدن میں بجلی کی طرح دوڑ جاتا ہے لیکن طربیہ اثر اس پایہ کا نہیں۔ منشی پریم چند کے قصوں میں اختصار الفاظ کی خصوصیت حیرت انگیز ہے۔ ان کے قصے میں مقامی رنگ کی بہترین جھلکیں موجود ہیں۔"

(دنیائے افسانہ) کی اشاعت کے بعد بھی پریم چند نو سال تک زندہ رہے ان کے اسلوب بیان میں پختگی آتی گئی اور ان کے خیالات میں بلندی اور حقیقت پسندی پیدا ہوتی گئی۔

تاریخ ادب اردو میں پریم چند کا ذکر

(دنیائے افسانہ) کے بعد رام بابو سکسینہ کی تاریخ کا ترجمہ مرزا محمد عسکری نے ۱۹۲۹ء میں شایع کیا۔ یہ ادب اردو کی موجودہ تاریخوں میں سب سے زیادہ مستند کتاب تسلیم کی گئی ہے۔ پریم چند کے متعلق لکھا ہے۔

"میدان قصہ گوئی کے شہسوار ہیں ۔۔۔۔ چھوٹے چھوٹے قصے لکھنے میں ید طولیٰ رکھتے ہیں اور حق یہ ہے کہ آپ کے اس قسم کے افسانے اس زمانے کے کثیر التعداد نام نہاد ناولوں کے ساتھ وہی نسبت رکھتے ہیں جو سچے نگینوں کو جھوٹے پتھروں کے ساتھ ہوتی ہے۔ آپ کو دیگر ناول نگاروں پر یہ فوقیت حاصل ہے کہ آپ نے ہندوستانی دیہات کے ہو بہو نقشے اور یہاں کے کسانوں کے سچے سچے واقعات نہایت عمدہ طریق سے اپنے ناولوں میں بیان کیے ہیں۔ آپ کبھی مبالغے کو اپنی تصانیف میں پاس نہیں آنے دیتے اور نہ کبھی حق اور سچائی سے انحراف کرتے ہیں۔ آپ کی عبارت میں بے حد آمد اور زور معلوم ہوتا ہے۔ لطیف استعارات اور تشبیہوں سے عبارت کی خوبی اور بڑھ جاتی ہے۔ ۔۔۔۔ آپ نفسیات کے بھی پورے ماہر ہیں آپ کے کلام میں ظرافت اور کہیں درد دونوں رنگ دکھاتا ہے جیسے کہ دھوپ اور چھاؤں۔ آپ کے کیرکٹر نہایت مخصوص جیتی جاگتی تصویریں ہوتی ہیں۔" ؎۵

پریم چند کے متعلق وقار عظیم انبالوی کی رائے

۱۹۳۵ء میں وقار عظیم انبالوی نے (افسانہ نگاری) اور

؎۵ ۔ تاریخ ادب اردو صفحہ (۱۴۰)

(ہمارے افسانے) دو کتابیں شایع کیں۔ اصل میں یہ دونوں کتابیں ایک ہی ہیں پہلی کتاب فن افسانہ پر ہے اور دوسری اردو افسانوں اور افسانہ نگاروں پر۔ پہلی کتاب جو فن افسانہ نگاری پر لکھی گئی ہے اس میں لوازم افسانہ بتلائے گئے ہیں لیکن ساتھ ہی ساتھ ہر لازمہ افسانہ کے ساتھ وقار عظیم صاحب نے مثالیں بھی پیش کی ہیں۔ ان میں پریم چند۔ سدرشن۔ نیاز اور مجنوں کے افسانوں سے زیادہ مثالیں دی گئی ہیں۔ مثال کے لیے اس کتاب کا ایک باب (افسانہ کی سرخی) ہے اس میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ افسانے کے عنوانات مختلف طور پر قایم کیے جا سکتے ہیں۔ پریم چند کے متعلق لکھا ہے۔

> "پہلی چیز جس پر افسانہ کی بنیاد ہے وہ تحریک ہے اور پریم چند کے اکثر افسانوں کی سرخیاں مثلاً (آہ بے کس) (ماتا) (اندھیرا) (کرموں کا پھل) (غیرت کی کٹاری) (تریاچرتر) (خون سفید) وغیرہ افسانے پڑھنے کے بعد اگر ہم ان سرخیوں پر نظر ڈالیں گے تو اسی نتیجہ پر پہنچیں گے کہ واقعی یہی سرخی موجودہ افسانے کے لیے سب سے زیادہ موزوں ہے۔"

دوسری چیز وہ سرخیاں جہاں کسی مخصوص صفت کا ذکر ہے زیادہ نمایاں اور تصور زا ہیں مثلاً بڑے گھر کی بیٹی۔ نمک کا داروغہ وغیرہ۔

چوتھے باب "افسانے کی فنی ترتیب" میں رقم طراز ہیں کہ۔

> "ترتیب کا بہترین مواد اکثر افسانہ نگاروں کے نزدیک مقامی رنگ ہے اور اس لیے ہر زبان کے اچھے اچھے افسانہ نگار اپنے لیے کسی نہ کسی خاص مقامی خصوصیت کو مخصوص کر لیتے ہیں اور اپنے افسانوں کی بنیاد اس پر رکھتے ہیں۔ اردو میں پریم چند اور ان کا اثر قبول کرنے والوں کے افسانے اس رنگ کی بہتر سے بہتر مثالیں پیش کر سکتے ہیں . . . . ."

وہ فطرت انسانی کی شیریں اور تلخ حقیقتوں پر عبور رکھتے ہیں انھیں نفسیات نے عام انسانی فطرت کی نازک لطافتوں سے آگاہ کر رکھا ہے۔ انھیں معلوم ہے کہ انسانی فطرت کی کونسی رگ کس وقت چھیڑنی چاہیے اور کس رگ کا کس وقت چھیڑا جانا خطرناک اور

خلاف فطرت ہے۔ اس کی صدہا مثالیں ہمیں پریم چند کے افسانوں میں ملیں گی جن میں سے اکثر میں انہوں نے دیہاتی زندگی کو اپنا پس منظر بنایا ہے اور اپنے افسانے کی بنیاد بھی اسی ترتیب سے رکھی ہے۔"

اس کے بعد تقریباً ہر باب میں وقار عظیم صاحب نے پریم چند کے افسانوں سے مثالیں دی ہیں اور ان کی خدمات کو بجا طور پر سراہا ہے۔

ان کی دوسری کتاب (ہمارے افسانے) دو حصوں پر تقسیم کی گئی ہے پہلا حصہ (ہمارے افسانے) ہے اور دوسرا (ہمارے افسانہ نگار) ان میں پریم چند کا نام سر فہرست ہے اور ان کے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ حسب ذیل ہیں۔

> "پریم چند اردو افسانہ نگاری کے بادشاہ ہیں۔ ان کے افسانوں میں قریب قریب وہ ساری باتیں موجود ہیں، جو مختلف حیثیتوں سے افسانے کو بلند بناتی ہیں...... انہوں نے اپنے افسانوں کو ایک نہیں بیسیوں طریقوں سے دلچسپ اور دلکش بنایا ہے اور ہر مذاق کا آدمی انھیں پسند کرنے پر مجبور ہے۔"

پریم چند کے افسانوں کی خصوصیت

اُن کے افسانوں کی پہلی خصوصیت جذبہ قومی ہے اور اس میں وہ تمام افسانے آجاتے ہیں جو ہندوستان کی عظمت و جلال سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان میں راجپوتوں کی زندگی سے تعلق رکھنے والے افسانے نہایت بلند پایا ہیں۔

دوسری خصوصیت ان کا مقامی رنگ ہے اور اس میں وہ افسانے شامل ہیں جو دیہاتی اور ہندو گھرانوں کی زندگی سے متعلق ہیں ...... دیہاتیوں کے مصائب کو ایسے طریقے سے بیان کیا گیا ہے کہ ہم پڑھنے کے لیے اپنے آپ کو مجبور پاتے ہیں اس کا ایک سبب یہ ہے کہ پریم چند دیہات کی حسین فضاؤں کو ہماری نگاہوں کے سامنے جما دیتے ہیں اور جب ہمیں دلچسپی ہو جاتی ہے تو پھر ان کے آفات کا دکھڑا سنا کر ہماری آنکھوں سے گنگا جمنا بہا دیتے ہیں۔

تیسری خصوصیت فطرت انسانی کا گہرا مطالعہ ہے۔ افسانہ نگار نفسیات سے زیادہ کام لے کر افسانہ کو بلند معیار پر لے جاتے ہیں۔ پریم چند کے افسانے نفسیاتی مطالعہ اور مشاہدہ سے بھرے پڑے ہیں اس سے پریم چند نے اس قدر کام لیا ہے کہ اپنے اسٹائل میں اپنے طرز بیان میں اور اپنے جملوں میں جہاں تشبیہات دیتے ہیں تو انھیں نفسیاتی محسوسات کو کام میں لاتے ہیں۔

ان کے کردار زیادہ تر مثالی ہوتے ہیں جن کے اعمال ہمارے لیے نمونہ بن سکتے ہیں وہ اپنے کرداروں کو عموماً ابتدا ہی میں ہمارے سامنے پیش کر دیتے ہیں اور ان کی خصوصیات سے بھی واقف کرا دیتے ہیں۔

ان کے افسانوں کا خاص حسن اصول کے خلاف ان کی تفصیلات ہی میں ہے۔ آخر میں وقار عظیم صاحب نے ان کی زبان کے متعلق اپنی رائے اس طرح پیش کی ہے۔

"وہ ہر چیز کو نہایت آسان اور پر لطف زبان میں بیان کرتے ہیں۔۔۔۔ ہندی اور فارسی کے لفظوں اور ترکیبوں کا شیریں امتزاج تشبیہوں اور استعاروں کی عمومیت اور نفسیاتی عالمگیریت۔ الفاظ کا برمحل استعمال یہ چیزیں پڑھنے والے کو اپنی طرف کھینچتی ہیں۔۔۔۔ ان کا طرز بیان شگفتہ ہے اور جا بجا مزاح کے نازک اور چھوٹے ٹکڑے خوب صورت نیلے آسمان پر چمکتے ہوئے ستارے معلوم ہوتے ہیں۔

پریم چند اور ان کے افسانوں کے متعلق مبالغہ نہ معلوم ہو تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ پریم چند کے افسانے ہندوستان کی سرزمین کی بہترین پیداوار ہیں"

ادارۂ رسالہ (زمانہ) نے (یادگار پریم چند) کے نام سے ۱۹۳۶ء میں ایک خاص نمبر نکالا اس کو چھوڑ کر اور کوئی ایسی کتاب اردو میں نہیں کہ پریم چند کے متعلق تفصیلی مواد دے سکے (یادگار پریم چند) بہت ضخیم ہے اور پریم چند کے متعلق شاید ہی کوئی ایسی بات ہو جو چھوٹ گئی ہو (پریم سوگ) حسام الدین خاں غوری سکندر آبادی نے شائع کی اس میں مصنف نے پریم چند کی حیات اور ان کے ادبی کارناموں سے زیادہ شخصی تعلقات پر زور دیا ہے۔ اس سے پریم چند کی علمی زندگی پر روشنی پڑتی ہے اور یہ کتاب پریم چند آنجہانی کے لیے

نذر عقیدت کا کام دے سکتی ہے۔

"مجلس" میں پریم چند کی یاد | ۳۴-۱۹۳۳ء میں گورنمنٹ کالج میں محفل ادب منعقد ہوتی تھی اس میں مقالے پڑھے جاتے اور علمی مباحث پر گفتگو ہوتی اس "مجلس اُردو" کے اراکین نے اپنے مقالوں کو "مجلس" کے نام سے کتابی شکل میں شایع کیا ہے۔ کتاب کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے "مجلس اردو" کے اراکین موجودہ زمانے کے مشہور انشاپرداز اور مصنفین ہیں۔ اس "مجلس اُردو" میں آغا عبدالحمید صاحب نے اپنا مقالہ "پریم چند" سنایا تھا۔ جو اس کتاب میں سب سے پہلے شایع ہوا ہے۔

آغا صاحب نے چار ناولوں پر تنقید کی ہے اور افسانوں پر عام رائے کا بھی اظہار فرمایا ہے۔ اس رائے سے پروفیسر آل احمد سرور بھی متاثر ہوے ہیں۔ اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنے مضمون کی تیاری میں اس کتاب سے بھی مدد لی ہے۔ چونکہ اکثر جملے مشترک ہیں اس لیے ہم نے پروفیسر صاحب موصوف کی کتاب سے اقتباس لے لیا ہے جو آگے کہیں ملیگا۔

آغا صاحب پریم چند کے متعلق فرماتے ہیں۔

"پریم چند ایک اعلیٰ درجہ کے قصہ گو اور بیسوں جیتے جاگتے کرداروں کے خالق ہیں۔ غالباً وہ پہلے مصنف ہیں جنھوں نے اپنے گرد وپیش کو ایک عمیق اور بے تعصب نظر سے دیکھا اور اپنی معاشرت کا گہرا مطالعہ کیا۔ وہ یقیناً پہلے ناول نویس ہیں جنھوں نے انسانی دل کو بغور اور ہمدردانہ دیکھا اور اس کی حرکت کا تجزیہ کیا"[1]

گو پریم چند ایک حقیقت نگار ہیں مگر ان کی حقیقت نگاری بے جان جزو نمائی ہو کر نہیں رہ جاتی وہ اپنے شاعرانہ طرز بیان سے اس میں ایک رومانی ماحول پیدا کر دیتے ہیں۔۔۔۔۔ پریم چند کی حقیقت نگاری ان کے ناولوں کو تاریخی سندات کی اہمیت بخشتی ہے"[2]

پریم چند قصہ کی ترتیب میں بہت دسترس نہیں رکھتے۔ وہ پلاٹ کی تعمیر ثمر کی

---

[1] مجلس صفحہ (۹)۔ [2] مجلس صفحہ (۱۵)۔

طرح نہیں کر سکتے بناوٹ کے لحاظ سے ان کے ناولوں میں کوئی تنوع اور جدت نہیں ان کے ناول بہت غیر مربوط اور غیر منظم ہوتے ہیں اور بعض اوقات تو وہ مختصر افسانوں کا سلسلہ بن کر رہ جاتے ہیں" ۔ لہ

وہ زندگی کو ایک نقاد کی طرح دیکھتے ہیں اور ان کے ناول صحیح معنوں میں زندگی کی تنقید ہیں لیکن وہ یاس پرست اور تباہ کن نقاد نہیں زندگی پر جو سوال اٹھاتے ہیں اس کو گالزوردی کی طرح وہیں نہیں چھوڑ دیتے کہ پڑھنے والے کو خود اس کا جواب تلاش کرنا پڑے بلکہ جواب کے متعلق کچھ اشارے بھی کر دیتے ہیں۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ پریم چند نے زندگی کو سمجھنے اس کے معنے ڈھونڈھنے اور اس کا نظام جاننے کے لیے ایک زبردست کوشش کی ہے ...... یہ کوشش بذات خود ایک بڑا کارنامہ ہے۔ زندگی کو دیکھ کر اس پر سوال کرنے کی ہمت ہر ایک میں نہیں ہوتی" ۔ ٢ہ

"وشال بھارت" میں پریم چند پر اظہار خیال | ۱۹۳۶ء میں "وشال بھارت" کے ہندی رسالے میں ہندی کے افسانہ نگاروں پر ایک تفصیلی مضمون شایع ہوا ہے اس مضمون کا خلاصہ اردو اکتوبر ۳۶ء میں چھپا ہے۔ پریم چند کے متعلق لکھا گیا ہے کہ انھوں نے۔

"ہندی ادب کو بہت متاثر کیا ہے اور ایک عرصہ تک یہ اثر باقی رہے گا وہ موجودہ دور کے سب سے زیادہ مقبول ترین مصنف ہیں۔ پریم چند بے زبان عوام کے ترجمان ہیں۔ کسان کے جذبات۔ حالات اور خیالات کی اتنی صحیح تصویر ہندوستان کے کسی مصنف نے اب تک نہیں پیش کی"۔

ہندوستان کے تین سب سے باکمال افسانہ نویس ٹیگور۔ شرت چندر اور پریم چند زندگی کے تین مختلف شعبوں کے مالک ہیں۔ ٹیگور نفس کی ایک ایک باریکی کو بے نقاب کر سکتا ہے۔ شرت چندر گھر کے ہر پہلو سے آشنا ہے اور اس میدان میں اس کا کوئی ہمسر نہیں اور جب انسان اپنی شخصیت کو کھو کر گھر سے باہر قدم رکھتا اور بھیڑ میں گھل مل جاتا ہے تو پریم چند کا دائرہ شروع ہوتا ہے"۔

"افسانہ" میں پریم چند کا ذکر | ان کتابوں کے بعد ۱۹۳۷ء میں اور تین کتابیں پروفیسر مجنوں

لہ۔ مجلس صفحہ (۲۰) ٢ہ۔ مجلس صفحہ (۳۷)۔

گورکھپوری کی کتاب (افسانہ) صغیر احمد جان کی (تنویر ادب) اور علی حسنین زیبا کا مقالہ (اردو ادب بیسویں صدی میں) شایع ہوئیں۔

مجنوں کی کتاب انگریزی افسانوی ادب کی مختصر تاریخ بھی کہی جا سکتی ہے۔ جس میں روس۔ فرانس۔ امریکہ۔ اور انگلستان۔ کے سب ہی ادیب شامل ہیں۔ پروفیسر مجنوں نے اپنی کتاب کو ختم کرتے ہوئے اردو افسانہ نگاروں پر اظہار خیال کیا ہے۔ پریم چند کے متعلق وہ ایک جامع اور مختصر رائے پیش کرتے ہیں۔

"پریم چند ان افسانہ نگاروں میں ہیں جن کا معترف شبلی جیسا انشا پرداز رہ چکا ہے پریم چند فطرت کی طرف سے فسانہ نگاری کا فن لے کر آئے ہیں۔ انہوں نے اپنا موضوع ہندوستان کے طبقہ عوام کو رکھا ہے۔ پریم چند کبھی مکمل زندگی کا نقشہ نہیں پیش کرتے ان کے افسانوں کے اجزائے ترکیبی چند چھوٹے چھوٹے مگر دلکش اور بصیرت افروز واقعات ہوتے ہیں۔ پریم چند کا مطمح نظر بڑی حد تک خارجی یا تمثیلی ہوتا ہے ان کے افراد قصہ اپنے حرکات و سکنات اور بات چیت سے خود اپنے کردار پر روشنی ڈالتے ہیں...... ان کے مزاج میں ایک انفرادی خصوصیت ہوتی ہے جو کسی دوسرے افسانہ نگار میں نہیں پائی جاتی ...... پریم چند کا اسلوب بیان ان کا اپنا ہے جو نہایت سادہ بے تکلف مگر دل پذیر ہوتا ہے۔"

صغیر احمد جان صاحب نے تاج صاحب کے مقدمہ (پریم بتیسی) دوم سے مواد لیا ہے لیکن آخر میں ایک بات لکھتے ہیں۔

"اگرچہ منشی صاحب مختصر افسانوں کے بانی ہیں لیکن ابتدا ہی سے آپ نے اس فن میں وہ کمال حاصل کر لیا کہ اب تک کوئی اور افسانہ نگار آپ کے مقابلہ میں پیش نہیں کیا جا سکتا۔"

علی حسنین زیبا نے اپنے مقالے میں تاج صاحب کے الفاظ نقل کر دیے ہیں۔

پریم چند کے متعلق پروفیسر اعجاز حسین کی رائے | ۱۹۴۰ء میں "مختصر تاریخ ادب اردو" دوسری دفعہ کچھ

اضافہ کے ساتھ شایع ہوئی۔ اس میں تحریر ہے کہ۔

"پریم چند کے افسانوں کو پڑھتے ہوئے کبھی ایک لمحہ کے لیے یہ نہیں خیال ہو سکتا کہ ہم ان لوگوں کے حرکات و سکنات کا مطالعہ کر رہے ہیں جو ہم میں سے نہیں ہیں وہی روزمرہ زندگی وہی صبح و شام جس سے ہم کو روز دو چار ہونا پڑتا ہے ان کے افسانے دلچسپ مواد ہیں۔ جس عام زندگی کو ہم خشک اور اتنی سادی سمجھتے ہیں کہ دلکشی کا شاید کوئی عنصر نہ ہو۔ اسی کو پریم چند اپنے انداز بیان سے بغیر تصنع کے اتنی پر لطف بنا کر افسانے میں دکھا دیتے ہیں کہ سرتاپا دلکش ہو جاتی ہے۔

آپ کے روداد افسانہ کا مخزن دیہات ہے: ہاں کے لوگوں کی سیدھی سادی زندگی۔ سیرت سچائی اور ایمانداری اور کبھی کبھی بعضوں کی بے ایمانی۔ چالاکی فتنہ پردازی کا نقشہ پریم چند کے افسانوں کی جان و مال ہے......... ہر چیز کو جیسا وہ دیکھتے ہیں ویسا ہی اپنے الفاظ میں بیان کرنے کی کامیاب کوشش کرتے ہیں...... پریم چند کے افسانے انسانی کردار کے روشن آئینے ہیں .... ان کے افسانوں میں مکالمہ نہایت مہتم بالشان خصوصیت ہے...... منشی جی کی زبان نہایت شستہ اور رواں ہے۔ سادگی اس کا جوہر ہے یوں تو فارسی و ہندی کے الفاظ عام طور سے وہ لاتے ہیں مگر اپنا مطلب نکالنے کے لیے بعض وقت ایسے ہی ہندی کے الفاظ استعمال کر جاتے ہیں جو اردو میں رائج نہیں لیکن اس خوبی کے ساتھ کہ اجنبی اور نامانوس نہیں معلوم ہوتے"[1]

دوسرے ایڈیشن میں اعجاز صاحب نے اس ایک فقرہ کا اضافہ فرمایا ہے۔

"اپنی زندگی کے آخری دور میں منشی جی کے خیالات اور اس کے ساتھ ان کے آرٹ میں البتہ ایک واضح تبدیلی نظر آتی ہے افسانوں میں حقیقت نگاری کا عنصر بڑھ جاتا ہے..... ادب کے ترقی پسند مسلک سے وہ اپنے کو وابستہ کر دیتے ہیں ہندوستانی پس منظر کو قایم رکھتے ہوئے ان کے افسانے اور ناولوں میں ہمہ گیری بڑھ جاتی ہے۔ یہ تمام خصوصیات ان کے افسانے (کفن) میں بہ یک وقت مرکوز ہو گئی ہیں لہذا اس کو ہم منشی جی کا شاہکار کہہ سکتے ہیں۔ اور غالباً یہ اس لیے اتنا پسند کیا گیا کہ آج دنیا کے بہترین افسانوں میں شمار ہونے لگا ہے"[1]

---

[1] مختصر تاریخ ادب اردو صفحہ ۳۲۴ مطبوعہ ۱۹۴۰ء۔

پریم چند کے متعلق جینندر کمار کی رائے | دہلی ریڈیو نے مشہور اور بڑے لوگوں پر تقریریں نشر کرائی ہیں ان کا ایک مجموعہ "کیا خوب آدمی تھا" کے نام سے جامعہ ملیہ نے شایع کیا ہے۔ جے نندر کمار نے اپنی شیریں زبان میں دہلی ریڈیو کی دعوت پر ایک مضمون نشر کیا ہے۔ وہ ہندی کے مشہور افسانہ نگار ہیں اور پریم چند کے دنیا سے اٹھ جانے کے بعد غالباً موجودہ افسانہ نگاروں میں ان کا درجہ سب سے بلند ہے۔ ان کا یہ مضمون پریم چند کی چھپن برس کی زندگی کا مختصر خاکہ ہے وہ لکھتے ہیں کہ۔

"ہندوستان میں ہندی اور اردو بھاشائیں جب تک ہیں پریم چند کا نام [illegible] نہیں سکتا۔ وہ دھندلا بھی نہیں ہو سکتا۔ دونوں زبانوں کو پاس لانے میں اور ان دونوں کو گھڑنے میں ان کا بہت ہاتھ ہے۔ ان کے خیالات ہندوستان کی زندگی میں گھل مل گئے ہیں اور وہ ہماری تاریخ کا جز بن گئے ہیں۔

وہ کھلی آنکھوں اور کھلی عقل سے چیزوں کو دیکھتے پرکھتے تھے لیکن آپس کے برتاؤ میں اتنے جاگے ہوئے تھے کہ کہا نہیں جا سکتا۔

وہ ایشور کے وجود کے قائل نہیں ہوتے تھے کہ ایشور اور دھرم اچھے سے زیادہ برے کے کام میں لائے جاتے ہیں وہ مصیبت زدوں کی حالت دیکھ کر خدا کے منکر ہو جاتے

پریم چند کی زندگی بھی لگن کا ایک نمونہ تھی اور وہ آدھی زندگی نہیں تھی اس میں ہم سب کے سیکھنے کے لیے بہت کچھ سبق مل سکتے ہیں۔"

۱۹۴۲ء کی مطبوعات میں پریم چند کا ذکر | ان کتابوں کے علاوہ گذشتہ سال ۱۹۴۲ء میں اردو ادب میں اور چار کتابوں کا اضافہ ہوا جن میں پریم چند کے ادبی کارناموں پر تنقید کی گئی ان میں پہلی کتاب پمفلٹ کی شکل میں ڈاکٹر سید محمد عبد اللہ کی تصنیف "اردو ادب جنگ عظیم کے بعد" ہے دوسری "تاریخ ادب ہندی" مولفہ ظہیر الدین احمد علوی۔ تیسری کتاب "نئے ادبی رجحانات" پروفیسر اعجاز حسین صاحب مصنف "مختصر تاریخ ادب اردو" کی ہے۔ چوتھی کتاب "تنقیدی اشارے" پروفیسر آل احمد سرور کے نشر شدہ تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے اکثر باتیں وہی کہی ہیں جو ہم دوسرے اور حسرت کی آرا میں نقل کر آئے ہیں صاحب موصوف نے ان کی دو خصوصیتیں بتلائی ہیں ایک جذبۂ قومی دوسرا مقامی رنگ۔ اس کے بعد لکھتے ہیں۔

"تفصیلات کا ذکر عموماً افسانے کے لیے عیب ہوتا ہے اس کی بجائے تصور آفرینی سے مدد لی جایا کرتی ہے۔ لیکن پریم چند جزئیات اور تفصیلات ہی کو حسن بناتے ہیں۔ یہ صحیح کہ ان کے افسانوں میں رومان کی کمی ہے لیکن پریم چند جس زندگی کا نقاش تھا اس کے لیے رومان کا مفسر بننا قدرے دشوار تھا تاہم رومان کا کامل فقدان نہیں۔"

دوسری کتاب "تاریخ ادب ہندی" ہے علوی صاحب نے ان کی ناول نگاری پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ انھوں نے ہندی ناول نگاری میں شاندار دور کی ابتدا کی ان کی کامیابی کا راز خود ان کی حسب ذیل خصوصیات میں ہے۔

۱۔ سماجی زندگی کی مصوری اور اس کی خرابیوں کو دور کرنا۔

۲۔ دیہاتیوں کے دکھ سکھ کا احساس کرنا۔

۳۔ انسان کی نفسیاتی تصویر کشی و اصلاح۔

۴۔ طنز و تشنیع کے عوض میٹھی میٹھی چٹکیاں لینا۔

۵۔ حقایق نگاری۔

۶۔ بیان کی روانی زور۔ اور مولانا شرر کا رنگ اختیار کرنا۔

یہ وہ خاص موضوعات ہیں جو پریم چند کی شہرت اور [illegible] کی تصنیفات کی جان ہیں[1]۔ علوی صاحب نے پریم چند کے افسانوں کے متعلق کچھ نہیں لکھا بلکہ ہندی کی ساری افسانہ نگاری کے لیے صرف ایک صفحے میں اشارے دیدیے اور چار پانچ صفحے میں افسانے کی

---

[1] ۔ تاریخ ادب ہندی صفحہ (۱۵۴)۔۔

طرز تحریر کے نمونے۔ اس سے نہ تو پریم چند کے افسانوں ہی پر روشنی پڑتی ہے اور نہ ان کے متعلق ہم کوئی اور مواد حاصل کر سکتے ہیں۔ البتہ ہندی زبان میں پریم چند کے ناولوں کے متعلق ایک کتاب شایع ہوئی ہے اس کا نام "پریم چند کی اپنیاس کلا ہے اس میں "گئودان" کے علاوہ باقی سب ناولوں پر سیر حاصل تبصرہ کیا گیا ہے۔

"نئے ادبی رجحانات" کو مصنف نے "مختصر تاریخ ادب اردو" کی اشاعت کے دو سال بعد شایع کیا اس لیے ہمیں پریم چند کے متعلق کوئی نئی چیز نہیں ملتی اس میں بھی اسی ایک جملے کی تشریح کی گئی ہے کہ زمانہ حال میں افسانہ کا موضوع سماج ہے۔ ہندوستانی سماج میں دیہاتیوں کی اکثریت ہے غریب زیادہ ہیں اور انہیں کے حالات کی عکاسی کی گئی ہے ان کے حالات لکھنے میں پریم چند پیش پیش رہے۔ اور ان کی زندگی ہی سے افسانہ نگاروں کا ایک بہت بڑا گروہ ان کی تقلید کرنے لگا جن میں مردوں کے علاوہ عورتیں بھی شریک ہیں یہ لوگ پریم چند کے پیام اور ان کے خیالات کی نہایت دلاویز اور دلچسپ انداز میں اشاعت کر رہے ہیں۔ ان کا ذکر ہم اگلے باب میں کریں گے۔

پروفیسر آل احمد سرور کی رائے — اس سلسلے کی آخری کڑی پروفیسر آل احمد سرور کی کتاب "تنقیدی اشارے" ہے۔ ناول نگاری کے سلسلے میں صاحب موصوف نے نذیر احمد سے مرزا رسوا تک تمام ناول نگاروں پر تنقیدی نظر ڈالی ہے اور ان سب کے ناولوں کے متعلق رائے دینے کے بعد تحریر فرماتے ہیں۔

> "یہاں تک کوئی ایسا نہیں ہوا جسے اول درجہ کا ناول نویس کہا جا سکتا لیکن عین حالت انتظار میں اس برادری میں پریم چند کا داخلہ ہوتا ہے جو اردو ناول کو بلندی وسعت اور گہرائی عطا کرتے ہیں۔ پریم چند صرف مختصر افسانے لکھنے ہی میں کمال نہیں رکھتے بلکہ وہ بہت بڑے ناول نویس بھی ہیں۔ بازار حسن۔ چوگان ہستی گوشۂ عافیت۔ پردہ مجاز۔ نرملا۔ غبن۔ میدان عمل۔ اردو کے بہترین ناولوں میں شمار کیے جا سکتے ہیں۔ اگر مجھے اجازت دی جائے تو میں کہوں گا "چوگان ہستی" اردو کا بہترین ناول ہے۔ اب تک

جتنے ناول نگار گذرے وہ صرف زندگی کے ایک گوشے کی تصویر بنانے پر قانع تھے پریم چند کا میدان اتنا ہی وسیع ہے جتنی کائنات ۔ وہ ایک اعلیٰ درجہ کے قصہ گو اور درجنوں جیتے جاگتے کرداروں کے خالق ہیں ۔ وہ ہندوستان میں بیٹھ کر ایران و توران کے افسانے نہیں لکھتے ۔ دہ یہیں کے مال سے اپنی دکان بساتے سجاتے ہیں ۔ مقامی رنگ مقامی خصوصیات ان کے یہاں اول سے آخر تک جھلکتی ہیں وہ انسانی فطرت کے بہت بڑے نباض اور نفسیات کے بہت بڑے ماہر ہیں ۔ ان کا مشاہدہ تیز قوی ہے ۔ انہیں کرداروں کا پیدا کرنا اور انھیں بڑھنے پھلنے پھولنے کا موقع دینا انہیں خوب آتا ہے ۔ ان کی حقایق نگاری میں شعریت نرالی ملتی ہے اور ایک بے تابی ایک آوارہ نگہی ٹپکتی ہے جو آرنلڈ بینٹ کی یاد دلاتی ہے وہ شاعر بھی ہیں فلسفی بھی ۔ ان کا ایک خاص تصور حیات ہے وہ غریبوں اور مظلوموں کے بڑے ہمدرد ہیں ۔ کسانوں کے جذبات اور دیہاتی زندگی کے موقعے ان کے یہاں بڑی کثرت سے ملتے ہیں ۔ جہالت غربت اور بیماری ۔ رسم و رواج کا بھوت ۔ دولت کی غلط تقسیم ۔ مذہب کے نام پر انسانیت کا خون پریم چند سے دیکھا نہیں جاتا اس کے لیے انہوں نے بڑے تیز تیز نشتر تیار کیے ہیں پریم چند کا خیال یہ ہے کہ "انسان کی فطرت نہ بالکل سفید ہوتی ہے نہ بالکل سیاہ اس میں دونوں رنگوں کا عجیب اتصال ہوتا ہے اگر حالات گردو پیش اس کے موافق ہوئے تو فرشتہ بن جاتا ہے اور ناموافق ہوئے تو شیطان ۔ وہ حالات مذکورہ کا محض ایک کھلونا ہے" مگر پریم چند اس پر بھی زور دیتے ہیں کہ ہماری سیرت ہی ہماری تقدیر ہے ۔ پریم چند ایک بہت بڑے تمدنی نقاد ہیں وہ زندگی کی بھول بھلیاں دیکھ کر مایوس نہیں ہوتے بلکہ اس میں سے ایک راستہ نکالنے کی کوشش کرتے ہیں ۔ ان کی مصلحانہ کوششوں کو بعض انقلاب پرست اچھی نظر سے نہیں دیکھتے ۔ ان کا خیال یہ ہے کہ پریم چند اس خلیج کو پاٹنا نہیں چاہتے جو امیر و غریب کے درمیان ہے اسے کم کرنا کافی سمجھتے ہیں لیکن اس دور میں یہ بھی کچھ کم غنیمت نہیں ۔ سور داس ۔ سمن ۔ دنے ۔ نرملا اور گیان شنکر ان کے غیر فانی کردار ہیں ۔ یہاں آکر معلوم ہوتا ہے کہ زندگی میں افراد کی فتح و شکست نہیں ہوتی بلکہ گروہ یا مقصد کی فتح یا شکست ہوتی ہے پریم چند کی زبان ناہموار ہے ۔ فارسی کے فقروں کے ساتھ ساتھ ہندی کے الفاظ استعمال کرتے ہیں اور ہندی لکھتے لکھتے فارسی پر اتر آتے ہیں ۔ بایں ہمہ ان کا طرز سادہ عام فہم اور پُر زور ہے ۔ سادگی میں جوش پیدا کرنا ان کا کمال ہے ....

ان کے بعد اب تک کوئی اور اس پایہ کا ناول نگار نہیں پیدا ہوا۔[۱]

پریم چند کی افسانہ نگاری کے متعلق پروفیسر موصوف کا یہ خیال ہے۔

"پریم چند جو درجنوں لازوال کہانیوں کے خالق ہیں افسانہ نویسی کے گر سے پوری طرح واقف نہ تھے وہ قصے کی ترتیب کا بہت اچھا سلیقہ نہ رکھتے تھے اور اکثر اِدھر اُدھر کی باتوں میں کہانی کا اصل مقصد بھول جاتے تھے۔ مگر چونکہ وہ شدید احساس اور تیز نظر کے مالک تھے۔ اس لیے ان کی نظر زندگی کے حقایق پر پڑھی جاتی تھی اور وہ براہِ راست زندگی سے خام مواد تیار کر لیتے تھے۔ افسانہ نگاری سے انھوں نے تنقید حیات کا کام لیا۔ ان کے اوپر میتھو آرنلڈ کا وہ فقرہ صادق ہوتا ہے جو انھوں نے ایک یونانی ڈرامہ نویس کے متعلق کہا تھا۔

پریم چند آخر وقت میں ترقی پسند ادب کے ہمنوا بن گئے تھے اور "کفن" ان کے اس دور کی بڑی اچھی نمایندگی کرتی ہے۔ میں اسے اُردو کی بہترین کہانیوں میں سمجھتا ہوں اس میں ایک لفظ بھی بیکار نہیں ایک نقش بھی دھندلا نہیں۔ شروع سے آخر تک جیتی واقعیت اور تلوار کی سی تیزی اور صفائی ہے۔ پریم چند نے ایک دفعہ تو حقیقت کو مردانہ وار دیکھا ہے"[۲]

کتابوں کے علاوہ دیگر ماخذ ان کی کتابوں کے علاوہ ہندوستان میں جتنے رسالے شایع ہوتے ہیں ان میں اکثر ایسے ہیں کہ اپنے سالانہ نمبر اور افسانہ نمبر وغیرہ شایع کرتے رہتے ہیں بعض رسائل میں افسانہ نگاری پر کوئی مضمون آجاتا ہے تو اس میں بھی پریم چند کا ذکر موجود ہوتا ہے۔ ایسے رسائل میں ساقی۔ ہمایوں ادبی دنیا۔ عالمگیر۔ شاہکار۔ ادب لطیف۔ اردو۔ زمانہ۔ ادیب۔ سہیل۔ نگار۔ ایشیا۔ نئی زندگی۔ جامعہ۔ نیا ادب۔ سب رس۔ ہندستانی ادب۔ معاصر۔ ندیم کالجوں کے مجلے۔ اور دوسرے اَن گنت رسائل ہیں جن میں اگر افسانہ نگاری پر کوئی مضمون شایع ہوا ہے تو اس میں پریم چند کا ذکر کیا گیا ہے حقیقت تو یہ ہے اردو میں ناول نگاری اور افسانہ نگاری پر کوئی مضمون اس وقت تک مکمل نہیں کہلایا جا سکتا جب تک کہ اس میں پریم چند کی خدمات کا ذکر نہ کیا گیا ہو اور اس طرح اردو ادب کی کوئی تاریخ بھی اس وقت تک مکمل نہ ہوگی جب تک کہ اس میں پریم چند کا نام نہ آئے۔

---

[۱] تنقیدی اشارے صفحہ ۱۰۱۔ [۲] تنقیدی اشارے صفحہ ۲۲۔

دوسرا باب۔ حالات زندگی

پیدائش | منشی پریم چند کے والد عجائب لال پانڈے پور (بنارس) کے قریب ایک چھوٹے سے موضع مڈھوا لمہی میں رہتے تھے۔ دایم المریض بیوی اور ایک لڑکی ان کے خاندان کے افراد تھے ۱۸۸۱ء م ۱۹۳۷ سمبت میں ان ارکان میں ایک اور لڑکے کا اضافہ ہوا۔ عجائب لال نے اپنے بیٹے کا نام دھنپت رائے رکھا۔ اس لئے دھن تو اتنا نہ پایا جتنا کہ نام اور اس نام کے جاننے والے بھی بہت کم ہیں۔ آج اس دھنی کو سب پریم چند ہی پکارتے ہیں۔

بچپن | عجائب لال بیس روپیے ماہوار کے منشی ڈاک خانہ تھے اور انتقال کے وقت تک انھیں چالیس روپے کی ترقی مل گئی تھی ساتھ ہی ساتھ افراد خاندان میں بھی اضافہ ہوتا گیا اور وہ تنگی تلخی سے زندگی بسر کرتے تھے۔ وہ غریب تھے لیکن علم کے قدرداں تھے اور اپنے لڑکے کو انہوں نے رواج زمانہ کے مطابق مذہبی اور فارسی کی تعلیم دلائی ابھی پریم چند سات سال کے بھی نہ تھے کہ ان کی والدہ نے انتقال کیا اور والد نے دوسری شادی کرلی۔ اس طرح پریم چند مامتا سے محروم ہوگئے لیکن والد کی شفقت اور تعلیمی ذوق نے انھیں سیدھے راستے پر ڈال دیا تھا۔

تاہل | ابھی پندرہ سال ہی کے تھے کہ والد نے ان کی شادی رچا دی مگر اس قید کے باوجود وہ نہم تک پہنچ گئے ابھی تک سایہ پدری باقی تھا اور انھیں کسی قسم کی فکر کی ضرورت نہ تھی لیکن مشیت ایزدی نے انھیں یتیم بنا دیا اور اس کے ساتھ ہی گھر والوں کی پرورش کا بار بھی ان کے سر پڑ گیا۔ زیر پرورش لوگوں میں پریم چند، ان کی بیوی، سوتیلی ماں، اور ان کے دو لڑکے گویا پانچ آدمی تھے اور کمانے والا کوئی نہیں۔ اثاثہ والد کی تیمارداری تجہیز وتکفین

اور کربا کرم میں صرف ہو گیا اور اب فکر روز گار پریم چند کے سر سوار ہو گئی۔

تعلیم | لیکن انھیں اپنی تعلیم سے اتنا شغف تھا کہ وہ اس کو چھوڑنا پسند نہ کرتے تھے ہم یہاں انھیں کے الفاظ نقل کرتے ہیں تاکہ ان کے ذوق علم کا اندازہ لگایا جا سکے۔

"مجھے ایم اے پاس کر کے وکیل بننے کا ارمان تھا سرکاری ملازمت اس زمانہ میں بھی اتنی ہی مشکل سے ملتی تھی جتنی کہ اب۔ دوڑ دھوپ کر کے شاید دس بارہ روپیہ کی کوئی جگہ پا جاتا مگر یہاں تو آگے پڑھنے کی دھن تھی مگر پاؤں میں لوہے کی نہیں اشٹ دھات کی بیڑیاں پڑی ہوئی تھیں اور میں پہاڑ پر چڑھنا چاہتا تھا"[1]

وہ کوئنز کالج بنارس میں پڑھتے تھے اور بانس کی پھاٹک پر ایک لڑکے کو پڑھانے جایا کرتے تھے بانس کی پھاٹک سے پریم چند کا گھر پانچ میل دور تھا شام کے وقت چھ بجے ٹیوشن سے واپس ہوتے اور رات کے آٹھ بجے گھر آتے اور پھر دوسرے دن آٹھ ساڑھے آٹھ بجے صبح گھر سے نکل جاتے اور مسلسل بارہ گھنٹے گھر سے باہر رہتے۔ ان مصیبتوں سے میٹرک کا امتحان درجۂ دوم میں کامیاب کیا۔ کوئنز کالج میں درجۂ اول میں کامیاب ہونے والوں کی فیس معاف ہوتی تھی اس لیے انھیں درجہ دوم میں کامیاب ہونے سے بڑی مایوسی ہوئی مگر ان کی خوش قسمتی سے اسی سال ہندو کالج کھل گیا اس کے پرنسپل رچرڈسن تھے۔ پریم چند ان سے ملے تاکہ واقعات کا اظہار کریں لیکن پرنسپل اونچی کرسی کے آدمی ہوتے ہیں وہ ایسے طالبعلموں سے نہیں ملتے جو فکر روز گار کے مارے اور علم اور روٹی دونوں کے بھوکے ہوتے ہیں۔ پریم چند کا بھی یہی حشر ہوا۔ اور انھیں رچرڈسن نے عہدہ دارانہ مخصوص جملہ دھرا دیا "گھر میں کالج کی بات نہیں سنتا" حالانکہ کالج میں چپراسیوں کا حکم چلتا ہے وہ صاحب سے ملنے نہیں دیتے۔ غرض پریم چند لوٹ آئے اور سفارشوں

---

[1] ۔ زمانہ یادگار پریم چند نمبر صفحہ (۳)

کی تلاش میں پھرنے لگے۔ غریب کو سفارش بھی مشکل ہی سے ملتی ہے مگر جوئندہ یابندہ ٹھاکر نرائن سنگھ رکن مجلس انتظامیہ ہندو کالج نے ان کی سفارش کردی اور وہ رقعہ لیے خوشی خوشی گھر آئے مگر دو ہفتے تک بیمار رہے اور پرنسپل سے ملنے کا موقع نہ پا سکے۔ جب صحت ہوئی تو گئے اور رقعہ دکھایا۔ آزمائشی امتحان کے لیے متعلقہ مدرسین کے پاس بھیجے گئے۔ انگریزی کے استاد مطمئن ہو گئے مگر۔

"حساب کے پروفیسر بنگالی تھے۔ مین نے اپنا فارم دکھایا۔ نئی درسگاہوں میں عموماً وہی طلبہ آتے ہیں جنھیں کہیں جگہ نہیں ملتی یہاں بھی یہی حال تھا۔ کلاسوں میں کم استعداد اور ناقابل طلبہ بھرے پڑے تھے پہلے ریلے میں جو آیا وہ بھرتی ہو گیا۔ بھوک میں ساگ پات سبھی لذیذ معلوم ہوتا ہے مگر اب پیٹ بھر گیا تھا طلبا چن چن کر لیے جاتے تھے پروفیسر صاحب نے حساب میں میرا امتحان لیا اور مین فیل ہو گیا فارم پر حساب کے خانہ میں ناقابل اطمینان لکھ دیا گیا تھا"[1]

ٹیوشن | اب وہ پرنسپل کے پاس کس منہ سے جاتے ایک وکیل صاحب کے پاس پانچ روپیہ کی ٹیوشن کر لی اور وہیں انھیں رہنے کو بھی جگہ مل گئی۔ اب وہ صرف ناول پڑھتے اور مطالعہ کرتے رہتے۔ ان کی زندگی مر مر کے جئے جانے کا نام تھی۔ بے روزگاری میں خانگی ملازمت کا تنکے کا سہارا اور سارے خاندان کا بار ان کے لیے عذاب سے کم نہ تھا۔

ملازمت | ۱۸۹۹ء میں ان کی خوش قسمتی کہیے کہ وہ اپنی ایک کتاب چکرورتی (علم الحساب) انتہائی مجبوری کی صورت میں فروخت کرنے کے لیے ایک دوکان پر گئے اور وہیں اسکول کے ایک ہیڈ ماسٹر سے ان کی ملاقات ہوئی جس نے انھیں اپنے مدرسہ کی اٹھارہ روپے کی جائداد پر مامور کر لیا۔

ادبی زندگی | پیٹ کی فکروں سے نجات ملی تو پریم چند کے قلم میں روانی پیدا ہوئی اور ۱۹۰۰ء سے

---

[1] - یادگار پریم چند صفحہ (۵)

انھوں نے لکھنا شروع کیا۔ ٹیگور کی بہت سی کہانیوں کے ترجمے کیے پہلا ناول (ہم خرما و ہم ثواب) ۱۹۰۲ء میں اور (پریما) ہندی میں ۱۹۰۴ء میں شایع ہوئے۔ وہ ۱۹۰۲ء میں ٹریننگ کالج الہ آباد کی پریپریٹری کلاس میں داخل ہوئے۔ انٹرنس کامیاب امیدوار ایک سال اسی کلاس میں تعلیم پاتے تھے اور دوسرے سال جونیر کلاس میں ۱۹۰۴ء میں انہوں نے جونیر سرٹیفکیٹڈ ٹیچر کی سند لی ۱۹۰۵ء میں گورنمنٹ ہائی اسکول کانپور پر تبادلہ ہوگیا۔

"سوزِ وطن" کی اشاعت | ۱۹۰۷ء سے انھوں نے اپنی کہانیاں لکھنی شروع کیں۔ ان کی سب سے پہلی کہانی (دنیا کا سب سے انمول رتن) رسالۂ (زمانہ) میں شایع ہوئی اور پھر وہ (زمانہ) کے لیے کہانیاں لکھتے رہے۔ ۱۹۰۸ء میں کانپور سے مہوبا ضلع ہمیرپور پر تبادلہ ہوا یہاں پانچ کہانیوں کا ایک مجموعہ (سوزِ وطن) کے نام سے ۱۹۰۹ء میں شایع کیا۔ پریم چند کی عرفیت نواب تھی اسی مناسبت سے وہ اپنے ادبی کارنامے نواب رائے کے نام سے شایع کراتے تھے۔ چنانچہ (سوزِ وطن) پر بھی نواب رائے چھپا تھا۔ ان کہانیوں میں وقتی سیاسی رجحانات کا اظہار تھا یعنے صوبہ بنگال کی تقسیم اور "گرم دل" کانگریس کے متعلق خاکے تھے۔ یہ پانچوں کہانیاں حب الوطنی کے نظرافروز رنگ سے رنگی ہوئی تھیں۔ لیکن حب وطن کے دوسرے معنے باغیانہ خیالات تھے اس لیے پولس نے مصنف کی تلاش شروع کی۔ چونکہ یہ مجموعہ انہوں نے نواب رائے کے نام سے شایع کیا تھا اور دوسری بات یہ کہ اس کتاب پر مطبع کا نام بھی سہواً طبع نہ ہوا تھا اس لیے پولیس پریشان رہی آخر خفیہ پولیس نے پریم چند کو پا لیا اس وقت یہ ہمیرپور ضلع میں ناظر تعلیمات تھے۔ کلکٹر صاحب نے انھیں بلایا اور ایک ایک کہانی کا مطلب پوچھا اور بالآخر کہدیا کہ تم نے حکومت کے خلاف لکھ مارا ہے۔ اس لیے اس کا جرمانہ یہ ہے کہ ساری کاپیاں حکومت کے حوالے کر دو۔ اور آئندہ بغیر اجازت کچھ نہ لکھو۔ پریم چند نے حکم کی تعمیل کی۔ تین سو کاپیاں فروخت ہوچکی تھیں باقی سات سو سرکار کے حوالے کیں اور یہ سمجھے کہ "دوستا ہی چھوٹا" لیکن یہ تو تمہید ہی تھی ضلع کے

عہدہ دار تو اس بات پر تل گئے تھے کہ پریم چند کو بغاوت کی سزا دیں مگر ان کی نیکی آڑے آئی اور انسپکٹر آف اسکولس نے انھیں ان مخمصوں سے نجات دلادی۔ انھوں نے ۱۹۱۰ء میں انٹرمیڈیٹ کا امتحان کامیاب کیا ان کے مضامین انگریزی منطق فارسی اور تاریخ دوز موجود تھے۔ ان کے افسانے "زمانہ" (کانپور) "ہمدرد" (دہلی) اور "ادیب" (الہ آباد) میں شایع ہوتے تھے۔ "ہمدرد" مولانا محمد علی کا روزنامہ تھا اور انھوں نے پریم چند کو ہر قصہ کا تیس تیس روپے معاوضہ دیا تھا۔ ۱۹۱۲ء میں انھوں نے "جلوۂ ایثار" لکھا یہ آخری کتاب ہے جس پر نواب رائے کا نام لکھا تھا اس کے بعد انھوں نے اس نام کو چھوڑ کر پریم چند رکھ لیا اور کچھ عرصہ تک یہ نام (زمانہ) کے لیے مخصوص رہا۔

پریم چند کی علالت انھیں مہوبا ضلع ہمیرپور ہی میں وہ منحوس تحفہ ملا جو ان کا عمر ساتھی بن گیا یہ معدے کی شکایت تھی اور تقریباً لاعلاج۔ انھوں نے ۱۹۱۴ء میں اپنی درخواست سے بستی کے ضلع میں نیپال کی ترائی کے قریب تبادلہ کرالیا۔ مگر اس تبدیل آب و ہوا کا اثر یہ ہوا کہ مہوبا میں جو پیچش کا مرض انھیں شروع ہوا تھا اور ترقی کر گیا۔ اور انھیں اپنی صحت کی بہتری کے لیے رخصت لینی پڑی۔ وہ چھ مہینے علاج کرتے رہے لیکن بے سود۔ آخر پھر بستی میں آٹھیرے اور ۱۹۱۵ء میں دورہ کی ملازمت کی بجائے مدرسہ کی مدرسی قبول کرلی تاکہ اوسط اور بہتر غذا میسر آسکے۔

۱۹۱۸ء میں اول مددگاری نارمل اسکول گورکھپور پر ان کا تبادلہ ہوا اور ہندی کے مشہور ادیب مہابیر پرشاد پوتدار سے ملاقات ہوی جن کے مشورہ پر انھوں نے ہندی زبان میں "سرسوتی" کے لیے کہانیاں لکھیں۔ "سیواسدن" (بازارحسن) اور "پریم آشرم" بھی یہیں لکھے گئے۔ بی۔ اے کا امتحان بھی انھوں نے یہیں کامیاب کیا۔ پوتدار جی کے مشورے سے انھوں نے پانی کا علاج شروع کیا لیکن اس سے تو ندنکل آئی اور پیدل چلنا دوبھر ہوگیا اس لیے پھر علاج چھوڑ دیا۔

کانگریسی سرگرمیاں اور ملازمت سے استعفاء

وہ اس اسکول میں تاریخ خاص طور پر پڑھاتے تھے ۔ اصل کتاب کا سبق تو چند منٹ میں ختم کر دیتے اور پھر ایسی باتیں کہتے جو تاریخ میں نہ ہوتیں اور اکثر ہی تاریخ کے خلاف مواد فراہم کر کے بتلاتے اور کہتے کہ یہ کتابیں قوموں میں نفاق پیدا کرنے کے لیے لکھی گئی ہیں ۔

یہی وہ زمانہ ہے جب کہ کانگریس کی سرگرمیاں زوروں پر تھیں ۔ مہاتما گاندھی اور جواہر لال نہرو دیہات کے دورے کر رہے تھے ۔ اور رعایا، زمیندار اور حکومت ان تینوں کو ان کے حقوق سے واقف کرا رہے تھے ۔ کسانوں کو بے دخل کرنا ان پر ظلم کرنا اور ان کے مال و اسباب کو ضبط کر لینا اب اتنا آسان نہیں رہا تھا ۔ یہ دور عدم اشتراک کے پرچار اور ترک موالات کا تھا ۔ کسانوں کا اتحاد حکومت کے دل میں سیماب کی طرح رقص کر رہا تھا ۔ ان پر گولیاں چلائی جا رہی تھیں اور کسانوں کو جن پر بھروسہ تھا انہیں قید کیا جا رہا تھا ۔ غرض ہر طرف بدنظمی اور بے اعتمادی نظر آتی تھی ۔ جلیانوالہ باغ کا واقعہ بھی ہو چکا تھا ۔ اسی اثنا میں مہاتما گاندھی نے گورکھپور کا دورہ کیا اور دو لاکھ کے عظیم الشان مجمع میں تقریر کی ۔ اس تقریر سے متاثر ہو کر پریم چند نے فروری ۱۹۲۱ء میں ملازمت سے استعفاء دیدیا ۔ اور ایک گاؤں میں جا بسے ۔

فکر روزگار

گاؤں میں جانا ان کے لیے صحت کا پروانہ تھا ۔ انھوں نے غلامی سے کیا نجات پائی مرض سرسنہ سے بھی انھیں چھٹکارہ مل گیا ۔ وہ وہاں ایک سال گذارنے کے بعد مارچ ۱۹۲۲ء میں بنارس چلے گئے اور مہینے بھر کے بعد کانپور جا کر مارواڑی اسکول کے مدرس ہو گئے ۔ مگر ایک سال کے اندر ہی اندر کاشی ناتھ جی منیجر اسکول سے مخالفت ہو گئی اور انھیں اس ملازمت سے بھی دست کش ہونا پڑا ۔

مارچ ۱۹۲۳ء میں وہ بنارس چلے گئے اور اپنے وطن میں سکونت اختیار کی ۔ کئی ہزار کے صرفہ سے ایک مکان تعمیر کرایا ۔ پھر ہندی ادب کے مشہور سرپرست شیو پرشاد جی کی

ایثار سے رسالہ (مریادا) کے ایڈیٹر رہے کیونکہ (مریادا) کے سابق مدیر باپو سمپورن آنند
عدم اشتراک کی تحریک کے سلسلے میں جیل جا چکے تھے۔ جب وہ اپنی سزا کی میعاد ختم کر کے
واپس آئے تو شیو پرشاد جی نے انھیں کاشی ودیا پیٹھ میں مدرسی کی جگہ دی۔

سرسوتی پریس کا قیام | ایک سال تک یہاں کام کرنے کے بعد انھوں نے تین آدمیوں کے اشتراک
سے "سرسوتی پریس" قایم کیا۔ اس میں انھوں نے اپنے ساڑھے چار ہزار روپے لگائے
تھے لیکن تجارتی ناتجربہ کاری کی بنا پر نقصان اٹھاتے رہے اور آخر ۱۹۲۵ء میں ہندی
ادب کے دار الاشاعت گنگا پستک مالا آفس لکھنؤ میں لائبریری اسسٹنٹ کی سو روپے ماہوار
کی جائداد قبول کر لی۔

مطبع نول کشور سے تعلق | دس ماہ تک کام کرنے کے بعد بھی گذارہ کی کوئی صورت نظر نہ آئی
اس لیے اپریل ۱۹۲۶ء میں بنارس آ کر جون ۱۹۲۸ء تک رہے جولائی ۱۹۲۸ء میں دو سو
روپے ماہوار پر (مادھوری) لکھنؤ کی ادارت قبول کی اور نومبر ۱۹۳۱ء تک یہیں رہے اور
اپنی ہمہ جہتی قابلیت سے (مادھوری) کے معیار کو بہت بلند کر دیا۔ وہ اس کے ساتھ
مطبع نول کشور کی اردو ہندی کی درسی کتابیں بھی تیار کرتے تھے۔ منشی بشن نرائن بھارگو
مالک مطبع کے انتقال پر اسٹیٹ کورٹ کی نگرانی میں آ گئے اور مرزا محمد عسکری صاحب
آسی صاحب لکھنوی اور منشی پریم چند نے نومبر ۱۹۳۱ء میں نول کشور سے اپنا تعلق منقطع
کر لیا۔ اور اپنے بچوں کی تعلیم کے لیے ۱۹۳۲ء تک لکھنؤ میں مقیم رہے اور اس کے بعد
بنارس چلے گئے۔ ۱۹۳۵ء تک سرسوتی پریس کا کام کرتے رہے۔

رسالہ "ہنس" کا اجراء | انھوں نے اپنے پریس کے کاروبار کو بڑھانے اور اس کو ترقی دینے
کی امکان بھر کوشش کی۔ جنوری ۱۹۳۰ء میں (ہنس) جاری کیا مگر جون میں یعنی صرف
چھ مہینے بعد اس سے ایک ہزار کی ضمانت طلب ہوئی تو بند کر دیا اور چھ مہینے بعد جب
یہ حکم منسوخ ہو گیا تو جنوری ۱۹۳۱ء میں دوبارہ جاری کیا۔ تیسرے تجربے میں ایک کہانی

"قاتل" شایع ہوئی جس کی بنا پر ان سے دوبارہ ضمانت طلب کی گئی لیکن مسٹر بینا لال کلکٹر بنارس کی سفارش پر معافی مل گئی اور (ہنس) نکلتا رہا۔ اکتوبر ۱۹۳۵ء بھارتیہ ساہتیہ پرشد نے اس کا انتظام اپنے ہاتھوں میں لیا۔ جون ۱۹۳۶ء میں سیٹھ گوبند داس کے ایک مضمون کی اشاعت کی وجہ سے ضمانت طلب کی گئی۔ جس کی بنا پر اراکین انتظامی کمیٹی نے اس کو بند کر دینے کا اعلان کیا۔ ان کی یہ حرکت پریم چند کو ناگوار گذری اور انھوں نے دوبارہ اس کو اپنی ملکیت میں لے لیا۔ اور باوجود نقصان کے تادم مرگ چلاتے رہے اب بھی شیورانی دیوی اور ان کے ہونہار صاحبزادے مسٹر سری پت رائے کی نگرانی میں (ہنس) پریم چند کی یادگار بنا ہوا نکل رہا ہے۔

پریم چند اور ہندی ادب | یوں تو پریم چند ابتدا ہی سے ہندی میں لکھتے رہتے تھے لیکن ان کا زیادہ وقت اردو لکھنے میں گذرتا تھا۔ فی زمانہ بھی اردو کے مصنفین کی کتابیں بڑی مشکلوں سے فروخت ہوتی ہیں اور ایک ہزار کے ایڈیشن کی فروخت کے لیے برسوں انتظار کرنا پڑتا ہے۔ چنانچہ یہی حال پریم چند کا ہوا۔ وہ ملازمت سے کنارہ کش ہونے کے بعد ہندی کی طرف زیادہ راغب ہوئے۔ اور ۱۹۲۵ء سے تو اس میں شدت پیدا ہو گئی۔ (مریادا ۔ ۱۹۲۳ء) (مادھوری ۱۹۲۸ء) (ہنس ۱۹۳۳ء) اور (جاگرن ۱۹۳۳ء) کی ادارتیں اور اہتمام اس کا ثبوت ہیں۔ موخر الذکر ہفتہ وار اخبار تھا جو شنکر جی دیاس کے زیر اہتمام نکلتا تھا۔ پریم چند کا خیال تھا کہ اس پرچہ سے مطبع ترقی کریگا۔ مالی امداد ملے گی اور ان کی فکریں دور ہو جائیں گی لیکن اس کے برخلاف دو ہی سال میں انھیں دس ہزار کا خسارہ ہو گیا۔ اور ان کی کمر ہمت ٹوٹ گئی اس کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ مطبع کے کارندوں نے بھی ان سے دغا کی اور انھوں نے "جاگرن" کو مجبوراً بند کر دیا۔ لیکن اس دس ہزار کے گڑھے کو بھرنے کی فکر سوا ہو گئی۔

فلم کمپنی کی ملازمت | وہ مجبور ہو کر "اجنٹا سینی ٹون" بمبئی میں ڈرامہ نویس کی حیثیت سے

ساڑھے سات سو روپے ماہوار پر کام کرنے لگے۔ گر یہاں انھیں جتنا زیادہ روپیہ ملا اس سے زیادہ ان کے ضمیر کا خون ہوا جو ان کے لیے ناقابل برداشت تھا۔ تھیٹر کے مالک آجر تو ہوتے ہیں اور وہ اپنے آپ کو آمر بھی سمجھتے ہیں۔ ان کی ہاں میں ہاں ملانا اور دربارداری ان کے ملازمین کے فرایض میں داخل ہو جاتی ہے۔ خواہ کوئی کام اس کی طبیعت کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔ سینما کمپنی کے معاملہ میں اور ماحول سے زیادہ مخرب اخلاق اور ضمیر شکن شاید ہی کوئی دوسرا پیشہ ہو۔

یہاں پریم چند کے فن۔ ان کی زبان اور ان کے کارناموں کو سراہنا تو کجا ان کی تحریروں کی تراش خراش کر کے ان کی صورتیں مسخ کی گئیں۔ ان کے دو افسانے ڈرامہ کی شکل میں پیش کیے گئے۔ جن میں ایک "مزدور" تھا اور دوسرا " نوجیون" اس سے پہلے "سیواسدن" (بازار حسن) کو بھی قلمبندی کے لیے خریدا گیا لیکن یہاں بھی ارباب سینما کی وہی آمرانہ روح کارفرما رہی اور ان کے یہ تینوں ناول جو قلمبندی کے لیے حاصل کیے گئے یا جن کی قلمبندی کی گئی سب کا ناس ہوا اور پریم چند برداشتہ خاطر ہو کر معاہدہ کی مدت ختم ہونے سے پہلے مارچ ۱۹۳۵ء میں بنارس واپس ہو گئے۔ اور سرسوتی پریس کے کاموں میں اپنے آپ کو مصروف رکھا۔

انتقال | مہوبا ضلع ہمیر پور کا مرض انہیں تحفتاً مل ہی چکا تھا۔ اب بمبئی کے ایک سالہ قیام نے ان کی رہی سہی صحت کو اور بھی خراب کر دیا۔ معدہ کی کمزوری بڑھتی گئی آخر جون ۱۹۳۶ء میں ان کے مرض میں زیادتی ہوئی اور وہ جلندھر کا شکار بنے۔ وہ علاج کے لیے لکھنو گئے لیکن مرض میں افاقہ نہ ہونے سے واپس آ گئے اور بنارس میں ہومیو پیتھک علاج شروع ہوا۔ لیکن مرض الموت کا کوئی علاج نہیں۔

۷؍ اکتوبر کی صبح سے دست آنے شروع ہوئے شام تک کئی دست آئے اور طبیعت نڈھال ہو گئی آخر ۸؍ اکتوبر کی منحوس صبح نے اقلیم افسانہ نگاری کے شہنشاہ کو ہمیشہ کی نیند میں

سلا دیا۔

ہم پہلے ہی لکھ آئے ہیں کہ پریم چند کی شادی ان کے والد نے کمسنی ہی میں کر دی تھی۔ ابھی وہ پندرہ سال کے تھے کہ ان جھگڑوں میں آ پھنسے اور صرف ایک سال بعد والد کا انتقال ہو گیا۔ ان کو یہ شادی راس نہ آئی بیوی سے الگ رہ کر انھوں نے کئی سال گذار دیے لیکن اپنی بیوی کے کفیل وہ خود ہی تھے اور مستقل طور پر ماہانہ انھیں رقم ارسال کر دیا کرتے۔ ابھی یہ بیوی زندہ تھی کہ پریم چند نے شیورانی دیوی نامی ایک بیوہ خاتون سے بیاہ کر لیا وہ کنوار ضلع فتح پور کی رہنے والی ہیں ان کے والد نے ان کی شادی بہت کم عمری میں کر دی تھی اور وہ شادی کے کچھ عرصہ بعد ہی بیوہ ہو گئیں سماج کے رسم و رواج کے خلاف ان کے والد نے نیا جرأت آموز اقدام کیا اور پریم چند سے ان کا بیاہ کر دیا۔

شیورانی دیوی کی ادبی خدمات | انھیں ہندی میں معمولی شُد بُد تھی لیکن شادی کے بعد انھوں نے ایسی استعداد بہم پہنچائی کہ آج ہندی کی مشہور افسانہ نگار ہیں اور ان کے ترجمے دیگر زبانوں میں بھی شایع ہوتے ہیں۔ ان کی سولہ کہانیوں کا ایک مجموعہ (ناری ہردے) اور دوسرا مجموعہ (سیندور کی رکھشا) کے نام سے شایع ہو چکا ہے۔ پریم چند کے ساتھ انھوں نے نہ صرف ادبی کام کیے بلکہ سیاسیات میں بھی عملی حصہ لیا۔ لکھنو میں بائیکاٹ کے متعلق دھرنا رکھنے کے سلسلے میں انھیں ڈیڑھ ماہ کی سزا ہوئی۔ پریم چند کی وفات کے بعد بھی وہ قومی اور ادبی خدمات میں سرگرمی سے حصہ لیتی ہیں۔ ان کے بطن سے ۱۹۱۹ء میں سری پت رائے گورکھپور میں پیدا ہوئے اور امرت رائے ۱۹۲۲ء میں کانپور میں۔ ایک اور لڑکا بھی گورکھپور میں پیدا ہوا تھا جس نے بعارضہ چیچک انتقال کیا۔ انھیں ایک لڑکی بھی ہے۔

خانگی زندگی | والد کی زندگی تک تو انھیں کسی قسم کی تکلیف نہیں ہوئی لیکن ان کے انتقال کے بعد تو آسمان ہی ٹوٹ پڑا۔ انھیں اپنا اور اپنے متعلقین کا پیٹ پالنے اور تعلیم جاری رکھنے کے لیے پانچ روپیہ کا ٹیوشن کرنا پڑا آخر ان کی ملازمت اٹھارہ روپیہ کی حقیر رقم سے

شروع ہوئی۔ اور ان کی ادبی زندگی کی ابتدا کا بھی یہی زمانہ ہے۔ وہ زمانہ کے لیے کہانیاں لکھنے لگے۔

ہندی کتابوں سے آمدنی

ان کا پہلا ناول (ہم خرما و ہم ثواب) نکلا اس سے کوئی مالی فائدہ نہیں ہوا۔ لیکن جراٗتیں ضرور بڑھ گئیں۔ اس کے بعد (سوزِ وطن) شایع کیا اور اس کی جو درگت ہوئی اس کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ ہندی میں (پریما) پہلا ناول تھا اس سے بھی خاطر خواہ فائدہ نہ ہوا دوسرا ناول (سیوا سدن) (بازارِ حسن) لکھا اور کلکتہ پستک ایجنسی نے صرف پہلے ایڈیشن کے لیے ساڑھے چار سو روپے پیش کیے۔

یہ پہلا اتفاق تھا کہ پریم چند کو ادیب ہونے کا احساس ہوا۔ اس سے ان کی حوصلہ افزائی ہوئی جب انھوں نے (پریم آشرم) گوشۂ عافیت لکھ کر دیا تو اسی ایجنسی نے اس کتاب کے لیے تین ہزار روپے دیے۔ تیسرا ناول (نرملا) چاند پریس الہ آباد نے ۱۹۲۳ء میں شایع کیا اور ۱۹۲۸ء میں (رنگ بھومی) گنگا پستک مالا آفس لکھنؤ سے شایع ہوا اور پریم چند کو دو ہزار روپے ملے۔

یہ ان کی پہلی کتاب تھی جو ناگری رسم الخط میں لکھی گئی۔ یہ صوبہ متحدہ کی اس سال کی بہترین تصنیف سمجھ کر ہندوستانی اکیڈمی نے مصنف کو پانچ سو روپے نذر کیے اس کے بعد (کایا کلپ) لکھ کر انہوں نے اپنے ہی پریس سے شایع کیا اور ناگری پرچارنی سبھا بنارس نے اس کتاب پر دو سو روپے انعام دیا۔ اس کی ۱۹۳۶ء تک پانچ ہزار سے زائد کاپیاں فروخت ہو چکی تھیں۔ غرض پریم چند جب تک ملازم رہے بہت عسرت میں زندگی گذارا کیے۔ اردو کے دیگر مصنفین کی طرح وہ بھی مفلس ہی رہے۔ لیکن ہندی افسانوں اور کتابوں سے ان کو مدد ملتی رہی۔

اردو کتابوں سے آمدنی

انھیں اردو تصانیف سے بہت کم آمدنی ہوئی۔ مولانا محمد علی نے اردو میں ایک ایک کہانی پر تیس تیس روپے دیئے اور یہ غالباً ان کی ایک کہانی کا اردو میں

سب سے بڑا معاوضہ تھا۔ اس کے علاوہ بھی بعض رسالوں نے معاوضہ دیا مگر برائے نام (زمانہ)
سے تو جو ملا لے لیا اس لیے کہ وہ گھر کا پرچہ سمجھتے تھے۔

پریم چند نے اپنے ایک خط میں لکھا ہے۔

"اُردو سے اب تک دو ہزار روپے ملے ہوں گے (چوگان ہستی) اور (کنج عافیت)
دونوں آٹھ سو میں دیدیے کوئی ناشر ہی نہ ملتا تھا"

(چوگان ہستی کے متعلق ایک ناقد کی رائے ہے۔

"اگر پریم چند نے ساری عمر میں صرف یہی ایک ناول لکھا ہوتا تو بھی ان کو دنیا کے
کامیاب افسانہ نویسوں میں عزت کی جگہ مل جاتی۔ برنرڈ کی جسارت۔ رسل کی
آزادی۔ ڈکنس کی غربت نگاری۔ گالزوردی کا سا طنزیہ تبسم۔ ڈوما کی نقشہ کشی۔
راشد کی ٹیبسیں۔ نظامی کی سادگی۔ نفیسی کی عظمت۔ شرر کا جوش۔ رسوا کی معنویت۔
اور ٹیگور کی لطافتیں اگر ایک جگہ اور پورے تناسب کے ساتھ دیکھنی ہوں تو اس
ناول کی سیر کیجیے شاید یہی وجہ ہے کہ چینی۔ جاپانی۔ مرہٹی۔ جرمنی اور ہندی
سبھی زبانوں میں اس کے ترجمے یکساں مقبول ہیں۔
"ورلڈ از اے تھیٹر" اور "لائف از اے اسٹیج" ایسے کامیاب ناول بھی
اس کے ساتھ تولے جائیں تو شاید ہلکے ٹھیریں"[1]

اور (گوشۂ عافیت) کے متعلق اسی ناقد نے لکھا ہے۔

"زبان نہایت ہموار۔ پیاری۔ لچیلی۔ اور اتنی ستھری اور میٹھی ہے کہ فارسی
خط میں اردو اور ناگری حرفوں میں ہندی معلوم ہوتی ہے"[2]

ان دونوں کتابوں کو اردو کے پبلشر نے صرف آٹھ سو میں لیا اور اب تک اس کے
آٹھ آٹھ ایڈیشن شایع کر دیے۔ ایسی صورت میں پریم چند کی روحانی تکلیفوں کا اندازہ
بہ آسانی لگایا جا سکتا ہے۔ انہوں نے اردو پبلشروں کی اکثر جگہ شکایت کی ہے
اور پنڈت رنا تھ اشک کو ایک خط میں لکھتے ہیں۔

---

[1] زمانہ پریم چند نمبر صفحہ ۱۸۹ [2] زمانہ پریم چند نمبر صفحہ ۱۸۳۔

"بک سیلروں کا تجربہ آپ سے زیادہ تلخ مجھے ہوا ہے ...... میرے ڈیڑھ سو روپے دبائے بیٹھا ہے۔ لاہور ہی میں ایک دوسرا پبلشر میرے سات سو روپے ہضم کرنا چاہتا ہے۔ اخبارات کا یہ حال ہے بک سیلروں کا یہ بیچارہ مصنف کیا کرے"[1]

ان دلگداز اور حسرت آمیز الفاظ میں سینکڑوں افسانے پنہاں ہیں۔

ایڈیٹر زمانہ کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں :۔

"(پردۂ مجاز) ابھی تک پبلشر نے نہیں بھیجا۔ کئی خطوط لکھ چکا نہ روپے بھیجتا ہے نہ کتابیں نہ جواب دیتا ہے ...... سرد بازاری بلائے جان ہو رہی ہے ..... کتابوں کی کافی بکری نہیں ہے"[2]

گورکھپور سے ایک اور خط انہیں کو لکھا ہے۔

"(پریم پچیسی) حصہ اول کو چھپے ہوئے چار سال ہوئے مگر ابھی تک نصف پڑی ہوئی ہے حصہ دوم کی مشکل سے ڈیڑھ سو جلدیں بکیں۔ میں اس سے بہتر نہیں لکھ سکتا اور بہتر کامیابی کی امید نہیں رکھتا۔"

ایک خط میں وہ ذرا خفگی کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں لیکن حقیقت ہے۔

"اردو پڑھنے والوں کی تعداد کم نہیں ہے لیکن غالباً سب مفت کے پڑھنے والے ہیں سب کو دعویٰ نامہ نگاری ہے سبھی اہل قلم ہیں پڑھنے والا کوئی نہیں ہے"[3]

منشی جی نے ایک خط میں یہاں تک لکھ دیا ہے۔

"اب ہندی لکھنے کی مشق بھی کر رہا ہوں۔ اردو میں اب گذر نہیں ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ بال مکند گپت مرحوم کی طرح میں بھی ہندی لکھنے میں زندگی صرف کروں گا۔ اردو نویسی میں کس ہندو کو فیض ہوا ہے جو مجھے ہو جائے گا"[4]

مگر یہ پریم چند کا اپنا خیال تھا۔ ہم یہ کہتے ہیں کہ ۱۹۲۵ء تک سارے مصنفین کا یہی حال تھا کہ ان کی کتاب کا دوسرا ایڈیشن بہ مشکل چھپتا تھا۔ خود علامہ اقبال کی تصنیف (بانگ درا)

---

[1] ۔ زمانہ پریم چند نمبر ۱۱۱ ۔ [2] و [3] زمانہ پریم چند صفحہ ۱۰۹ ۔ ۱۰۸ ۔

جو پہلی دفعہ ۱۹۲۴ء میں صرف تین ہزار شایع ہوئی دو سال تک نہیں نکل سکی۔ حالانکہ اس وقت تک ان کی شہرت بقول مولوی عبدالرزاق صاحب راشد مرتب (کلیات اقبال) کے کشمیر سے راس کماری تک اور گجرات سے بنگال تک پھیل چکی تھی اور پنجاب کا تو بچہ بچہ ان سے واقف تھا۔ اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ بہت بڑے مفکر اور فلسفی تھے بلکہ اس لیے کہ وہ پنجاب کے بڑے جلسوں میں شرکت کرتے اور انجمن حمایت الاسلام کے عظیم الشان جلسوں کو چاہتے تو رلاتے اور چاہتے تو ہنساتے تھے۔

بہرحال منشی پریم چند کی زندگی بحر متلاطم تھی۔ یتیم ہونے کے بعد سے مرنے تک انہوں نے آرام کی صورت نہیں دیکھی۔ ادنیٰ مزدور کی طرح دن رات کام کرتے تب کہیں اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ بھر سکتے تھے۔

ایڈیٹر (زمانہ) کو ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"مجھے ان خرخشوں سے اس وقت نجات مل جانی چاہیئے تھی تاکہ کسی گوشہ میں بہ اطمینان پڑا ہوا کچھ لکھا پڑھا کرتا۔ مگر یہاں ابھی بال بچے پال رہا ہوں جو کام چالیس کی عمر میں ہونا چاہیئے وہ اب پچپن سال میں ہو رہا ہے جب آدمی پنشنر ہو جاتا ہے۔"[۱]

یہ بات بھی نہیں کہ وہ لالچی تھے روپیہ جمع کرنے کی ہوس تھی یا اچھا کھانے پینے اور زندگی عیش و آرام سے بسر کرنے کا خیال تھا۔ اس لیے کہ وہ صرف پیٹ بھرنے اور قومی کام کرنے کی خاطر ہر کڑی سے کڑی مشکل برداشت کر لیتے تھے۔ ایک مصنف اپنے خیالات کو اپنی تصانیف میں ظاہر کر کے قوم کو بیدار کر سکتا ہے۔ اور پریم چند یہی کر رہے تھے۔ اس کے لیے وہ اپنا دماغ اور دولت دونوں چیزوں کو فیاضانہ لٹا رہے تھے اور اس دھن میں انھیں نہ اپنے لباس کی پروا تھی اور نہ اپنے کھانے پینے کی۔ یوں بھی وہ دائمی

---

[۱] یادگار پریم چند صفحہ (۱۱۳)

مرض کا شکار تھے اور اچھی غذاؤں سے مجبوراً اجتناب کرنا پڑتا تھا جس کی عادت ان میں بہت کم تھی۔

اخلاق و عادات | وہ خود ایک غریب خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور بڑی آفتیں اور مصیبتیں جھیل کر تعلیم حاصل کی تھی اور اپنے پیر پر آپ کھڑے ہوئے تھے اس لیے ان میں کبر و نخوت کا شائبہ بھی نہ تھا۔ وہ ہر ایک سے ہنس کر ملتے اور انتہائی اخلاق و مروت سے پیش آتے لوگ ان کو خطوط لکھ کر ان کے دوست بن گئے تھے جب وہ ہندوستان کے مسلمہ ادیب بھی بن گئے اس وقت بھی ان میں رعونت اور تکبر پیدا نہیں ہوا بلکہ اس کے برخلاف وہ۔

نہد شاخ پر میوہ سر بر زمین

کے مصداق بن گئے۔

بے تعصبی | انہوں نے کبھی نہ اپنی زبان سے کسی کا دل دکھایا اور نہ قلم سے۔ مذہبی رواداری اور بے تعصبی میں وہ ضرب المثل تھے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ انھوں نے اردو کو چھوڑ کر ہندی زبان کو محض اس لیے اختیار کیا کہ وہ اردو کو ترقی نہیں دینا چاہتے تھے لیکن ہم جہاں تک غور کرتے ہیں نتیجہ ایسا نہیں پاتے۔ جس طرح افسروں کے ڈر سے (سوزِ وطن) کے ساتھ انہوں نے اپنے قلمی نام نواب رائے کو دفن کر دیا اسی طرح پیٹ کی آگ بجھانے کی خاطر انھوں نے ہندی میں لکھا۔ اور اس میں انھیں مالی فائدہ ہوا۔ اردو کی کئی کتابیں لکھنے پر بھی وہ فکر معاش سے اتنے آزاد نہ ہو سکے جتنے ہندی میں چند افسانے اور ناول لکھ کر۔ اس کو تعصب پر محمول کرنا ان کے ساتھ ناانصافی کے مرادف ہوگا۔

بردباری | ہر مصیبت میں صابر و شاکر رہنا ان کا شیوہ تھا بڑی سے بڑی مصیبت بھی انھیں پست ہمت نہ کر سکتی تھی ایک دفعہ انھیں خود اپنا تن ڈھانکنے کے لیے کپڑے نہ تھے ان کی بیوی نے انھیں کپڑے خریدنے کے لیے روپے دیے تو انھوں نے پریس کے ملازمین میں تقسیم کر دیے۔

اس سے ان کے جذبہ ایثار و ہمدردی اور رقیق القلبی کا پتہ چلتا ہے۔ یہ اور ایسی کئی مصیبتیں تو جسمانی ہیں جنھیں بعض انسان تو خندہ پیشانی سے جھیل جاتے ہیں اور ابرو پر بل نہیں آنے دیتے۔ اور اکثروں کو تو مجبوراً جھیلنی ہی پڑتی ہیں۔ لیکن ماں باپ کو اولاد کا غم جیسی مصیبت ہے اس سے بڑھ کر مصیبت اس وقت شاید ہی کوئی نظر آئے اس وقت بھی پریم چند میں وہی سکون اور وہی صبر و استقلال نظر آتا ہے۔ ۱۹۲۰ء میں جب ان کا ایک بچہ چیچک کے عارضہ سے انتقال کر گیا تو منشی دیا نرائن نگم کو ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"تقدیر نے تو اپنی دانست میں سزا دی ہوگی لیکن یہاں فکروں کا آدھا بوجھ سر سے دور ہو گیا مجھے بھی مرنے دیجئے اس گوشہ میں"[1]

جب وہ خود مرنے لگے تو بجائے اس کے کہ انھیں عام انسانوں کی طرح اپنی موت پر افسوس ہوتا اور ڈاکٹر اور عزیز و اقربا تسکین دیتے الٹا وہی اطمینان دلاتے ہیں مرنے سے پہلے انہوں نے اپنی بیوی سے کہا۔

"تمھیں میری روح و قلب کی طاقت ہو۔ گھبرانا مت۔ کیونکہ تم بھی یہاں بیٹھی نہ رہو گی"[2]

یہ اس بلند مرتبہ مصنف کا کردار ہے جس نے افسانے کی دنیا میں نام پیدا کیا اور اردو ادب کو معراج کمال تک پہنچنے میں مدد دی۔

تصویر کے پریم چند | مرزا محمد عسکری مترجم تاریخ ادب اردو سکسینہ نے پریم چند کی تصویر ان الفاظ میں کھینچی ہے۔

"میانہ قد۔ چھریرا بدن۔ کتابی چہرہ۔ ناک نقشہ نہایت درست۔ آنکھیں بڑی اور نمایاں سفید صافہ باندھے ہوئے جو اُن پر بہت زیب دیتا تھا۔

ایک اور تصویر ہے پستہ قامت۔ دُبلے پتلے آدمی تھے مگر مضبوط۔ پنجہ کھولنے پر انگلیوں کو موڑنا معمولی انسان کے لیے آسان نہ تھا ان کی وضع قطع سادی تھی۔ اچکن۔ پائجامہ یا کھلے گلے کا لمبا کوٹ پہنتے تھے غرض وہ اتنے سادہ کپڑے پہنتے تھے کہ اس سے زیادہ تصور ہی نہیں ہو سکتا۔ ان کی ذاتی ضروریات اس قدر کم تھیں کہ چھوٹے پیمانہ پر مہاتما گاندھی نظر آتے تھے"[3]

---

[1] - یادگار پریم چند صفحہ ۱۴ [2] - یادگار پریم چند صفحہ ۱۴ [3] پریم چند زمانہ نمبر صفحہ ۸۰ -

تیسرا باب۔ افسانہ۔ ارتقا اور فن

افسانہ کیا ہے | اب ہم یہ دیکھیں گے کہ پریم چند نے جس صنف ادب کو چار چاند لگا دیے وہ کیا ہے اور اس کی نشو و نما کس طرح ہوتی ہے۔

افسانہ کہانی ہے، ایسی کہانی جو ہمیں مہد سے لحد تک بہلاتی رہتی ہے۔ ہم اپنے بچپن میں اس کے لیے گوش بر آواز رہتے تھے۔ لڑکپن میں ان کہانیوں کو مزے لے لے کر پڑھا کرتے تھے۔ جوانی کی کئی راتیں ہم نے کہانیاں پڑھنے میں گذار دیں۔ غرض جہاں ہم بہل جاتے ہیں ان باتوں میں ہمیں دلچسپیاں اور رنگینیاں نظر آتی ہیں اور کیف و سرور حاصل ہوتا ہے۔ یہ سب کہانیاں ہیں البتہ ان کہانیوں کے معیار جدا جدا ہیں۔ کوئی کہانی ہمیں بے جان اور بے دلچسپ معلوم ہوتی ہے اور کوئی جاندار۔ کوئی ہمیں ہنساتی ہے اور کوئی رلاتی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ کہانی پڑھنے سے ہمیں رنج ہو رہا ہے ہم اپنے دل کو مسوس رہے ہیں لیکن پھر بھی پڑھے جاتے ہیں۔ بعض وقت آنکھوں سے آنسوؤں کی دھارا بہا دیتے ہیں لیکن کہانی نہیں چھوڑتے اور جب کہنے والا اس کمال سے کہے تو اس کے کیا کہنے۔ جب یہ دلچسپی کمال کا درجہ حاصل کر لیتی ہے تو تاثیر بن جاتی ہے اور ہم مجسم درد۔

قدیم تخیل | ان کہانیوں کے متعلق قدیم تخیل یہ ہے کہ یہ دل بہلائی کے لیے کہی جاتی تھیں۔ بادشاہوں کے دربار میں داستان گو مقرر تھے جو سر دربار بھی کہانیاں کہتے اور یہی کہانیاں بادشاہ کے لیے لوری کا کام دیتیں۔ گلی کی نکڑ پر یا کسی دروازے کے سامنے بڑے بوڑھے اور بچے جمع ہو جاتے اور وقت گذاری کے لیے کہانیاں کہی جاتیں۔ مگر ان دونوں کہانیوں میں فرق ہوتا بادشاہ اپنے شایان شان کہانی سنتا۔ ماضی کے یادگار قصے اس کے گوش گذار کیے جاتے اور بچوں کو بوڑھے انہیں کہانیوں سے جری اور مرد میدان بناتے۔

زمانہ کروٹیں لیتا رہا اور کہانیاں بھی اپنے پہلو بدلتی رہیں۔

قدیم افسانوی ادب | الیڈ اور اڈیسی اور رستم و اسفندیار کی کہانیوں کا دور گذر گیا اور گلستان بوستاں اور ایسپ کی کہانیاں کہی جانے لگیں۔ جب زمانہ اور بھی گذر گیا تو کہانیوں میں رومانیت پیدا ہوگئی اور ان میں عشق و محبت کے گن گائے جانے لگے۔ ان کو فن کا رتبہ یورپ اور امریکہ میں حاصل ہوا۔ واشنگٹن ارونگ اور اڈگار ایلن پو نے امریکہ میں۔ لارنس۔ جوائس اور سٹیون سن نے انگلستان میں اس پر خاص پابندیاں عائد کیں۔ اس سے پہلے تک من گھڑت قصے لکھے جاتے ملٹن جنت کی اور ڈانٹے دوزخ کی سیر کراتا تخت ہوا میں اڑتے تعویذ اور فلیتے بڑے بڑے مافوق الفطرت کام کر جاتے۔ اس کے بعد محبت کی دنیا آباد ہوئی۔

لیکن مذکورہ بالا مغربیوں نے ان تمام چیزوں سے ہٹ کر زندگی کے ہر مرحلہ کو اپنے افسانے کا موضوع بنا لیا" انسانی جذبات۔ غم و غصہ۔ سرور و انبساط۔ رشک و حسد۔ ظلم و ستم۔ رحم و کرم۔ خوف و ہراس۔ حسن و عیب۔ اور معصیت و عفت فطرت اور اس کی نیرنگیاں فلسفہ اور اس کی باریک بینیاں نفسیات اور معاشرہ غرض کوئی ایسی چیز نہیں بچی جسے افسانے کے پلاٹ کے لیے استعمال نہ کیا گیا ہو"[1]

یہ لہر دنیا کے سارے ادب میں دوڑ گئی۔ روس۔ اٹلی۔ امریکہ۔ ترکی۔ انگلستان غرض کہ ہر اعلیٰ زبان میں ایسے افسانے لکھے جانے لگے اور افسانہ آسمان سے زمین پر آرہا۔ یعنے "ادب برائے ادب" کا خیال فرسودہ ہوگیا اور ادب برائے زندگی کی برقی لہر دوڑ گئی اب افسانوں کے کردار ہم آپ جیسے انسان بن گئے ورنہ اب تک فوق الانسان ہی تھے۔ مغربی ممالک کے سیاسی رجحانات کا اثر ادب پر بھی پڑتا گیا اور عصری افسانہ نگاروں نے مقامی سیاست اور حکومت کے تانے بانے سے اپنے افسانے تیار کیے اور

---

[1] - ہمارے افسانے صفحہ ۸ -

اس طرح حکومت کے مظالم رعایا کے سامنے آتے گئے اور ان کے قلوب کو آزادی کے پنگوروں میں جھلانے لگے چنانچہ روس اور فرانس کا انقلاب افسانہ نگاروں ہی کا رہین منت ہے جن میں ڈاسٹفسکی۔ گورکی۔ ترجینیف اور چیخوف اور فرانسیسوں میں والٹیر سے موپاساں تک کم و بیش سب شامل ہیں۔

ہندوستان میں افسانہ نگاری | ان اثرات سے ہندوستان بھی بچنے نہ پایا۔ یہاں بھی افسانہ کے ارتقائی مدارج وہی ہیں جو اور دوسرے ادبیات میں پائے جاتے ہیں۔ مگر غدر کے بعد جس طرح تمام دوسرے اصناف ادب میں تغیر ہوگیا اسی طرح افسانہ میں بھی تبدیلی پیدا ہوگئی۔ اور عصری افسانہ نگاروں نے باغ و بہار، آرائش محفل اور فسانہ عجائب کی راہ کو قطعاً ترک کرکے اپنے لیے ایک نئی راہ نکالی۔

نذیر احمد | "اردو کے پہلے ناول نگار ڈپٹی نذیر احمد ہیں بعید از قیاس داستانوں کی جگہ اصلی واقعات اور صحیح معاشرت کو قصہ کی صورت میں پیش کرنے کا سہرا انھیں کے سر ہے"[1]

"ان کی زبان بہت آسان صاف اور سادہ ہوتی ہے البتہ کبھی کبھی بڑے بڑے عربی و فارسی کے غیر مانوس الفاظ لاتے ہیں اور کہیں رنگین عبارت اور صنایع بدایع سے اور بعض مواقع پر انگریزی الفاظ سے کام لیتے ہیں جن سے ہمارے نزدیک عبارت میں بجائے چستی اور خوب صورتی کے بھونڈا پن اور خرابی پیدا ہو جاتی ہے.... ان کی نثر کا جوہر اعلیٰ ان کا ظریفانہ رنگ ہے ...... ان کی ظرافت بہت ہلکی اور لطیف ہوتی ہے اور اس میں پھکڑ پن مطلق نہیں ہوتا"[2]

نذیر احمد نے افسانوں میں گھریلو زندگی کے واقعات صاف صاف بیان کیے ہیں اور اس وقت کی ہر لحاظ سے تمدنی کیفیت پیش کر دی ہے لیکن وہ دہلی کے باہر نہ نکل سکے۔ ان کے افسانے کی ساری چیزیں دہلی کی ہیں۔ انھوں نے فطرت سے زیادہ قربت حاصل کرلی

---

[1] داستان تاریخ اردو صفحہ ۵۱۵۔ [2] تاریخ ادب اردو حصۂ نثر صفحہ ۶۱۔

اور لوگوں کے لیے دلچسپی کے سامان فراہم کر دیے اور ان کے خیالات میں تبدیلی پیدا کی۔ ان کے ناولوں کے نمونے نامکمل سہی لیکن نقش اول کہلانے کے مستحق ہیں۔

سرشار | سرشار نے اپنے وطن لکھنؤ کی ٹکسالی زبان استعمال کی۔ محاورہ اور روزمرہ کی شوخی کو اپنا خاص رنگ بنایا طرز ادا مقفیٰ ضرور ہے لیکن ناموزوں نہیں معلوم ہوتی۔ "انھوں نے ایک ایسا طرز اختیار کیا تھا جو افسانہ نویسی کے واسطے موزوں تھا۔ ان کے قصے میں لوگ نفس قصہ سے زیادہ عبارت سے دلچسپی لیتے ہیں"[1] ان کے ناول میں خامیاں ضرور ہیں ان کے ناولوں میں پلاٹ اور کردار میں یکسانیت نظر نہیں آتی لیکن ان کی زبان اور اسلوب کی دلچسپی اور دلکشی میں پڑھنے والا اس قدر محو ہو جاتا ہے کہ اس کو ان خامیوں کا کم احساس ہوتا ہے۔

شرر اور سجاد حسین | یہ خامیاں سجاد حسین کے ہاں یکسر ندارد ہیں ندرت بیان کے لحاظ سے بھی ان کا مرتبہ بلند ہے مزاحیہ ناولوں کی کامیابی کا سہرا انہیں کے سر ہے۔ شرر نے ہر موضوع پر طبع آزمائی کی اور دفتر کے دفتر اپنی یادگار چھوڑ گئے۔ ان کی منظر نگاری مشہور ہے۔ "ناول کا ہر باب اور ہر باب کے تقریباً دو صفحے منظر کشی کی نذر ہو جاتے ہیں"۔ ان پر ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ اگر ان کے ناولوں میں کردار کے نام بدل دیے جائیں تو پھر ناولوں کو ممیز کرنا مشکل ہو گا۔ "تاریخی ناولوں میں صداقت کو بھی ہاتھ سے چھوڑ دیا ہے"[2] لیکن یہ ظاہر ہے کہ وہ تاریخ نہیں لکھ رہے تھے بلکہ ان کا مطمح نظر ناول لکھنا تھا اگر ایسا نہ کیا جاتا تو تاریخ اور ناول میں کیا فرق باقی رہ جاتا۔ ان خامیوں کے باوجود بھی انہوں نے اردو ناولوں کو انگریزی ناولوں کے شانہ بہ شانہ لا کھڑا کیا۔ انہوں نے اردو ادب میں اسکاٹ کی جگہ لی۔ اس کاٹ نے در پردہ

---

[1] - تاریخ ادب اردو صفحہ ۱۲۰ - [2] - دنیائے افسانہ -

تبلیغ کی اور باکمال ناول نگار بنا۔ شرر اپنے مقصد کو چھپا نہ سکے اور لوگوں کو انگشت نمائی کا موقع مل گیا۔

محمد علی اور راشد الخیری | حکیم محمد علی بھی انھیں کے ساتھی ہیں" راشد الخیری نے نذیر احمد کی اتباع کی اور پھر ان میں انفرادیت پیدا ہو گئی۔ انھوں نے عورت کی المناک زندگی کو اپنا موضوع بنا لیا اور اس طرح اردو افسانے میں ان کو خاص جگہ مل گئی۔ مگر ہر افسانہ ایک ہی انداز رکھتا ہے اور دو تین چیزیں پڑھنے کے بعد وہ تازگی محسوس نہیں ہوتی"[1] "غم و الم کی شدت جس کو بیان کرتے ہوئے زبان رُکتی ہے ان کے قلم سے نہایت تفصیل کے ساتھ بیان ہو جاتے ہیں اسی رجحان کی وجہ سے علامہ راشد الخیری کے ساتھ "مصورِ غم" کا لقب بہت زیب دیتا ہے"[2]

موجودہ افسانہ نگار | اب وہ زمانہ تھا کہ ساری دنیا اقتصادی مصائب میں گرفتار تھی۔ سیاسی انتشار اور حکومت اور رعایا کے درمیان اختلافات پیدا ہو چکے تھے ان چیزوں کا اثر ادب پر بھی پڑا ناولوں کے لکھنے اور پڑھنے کی فرصت نہ پا کر لوگ مختصر افسانہ نویسی اور افسانہ خوانی کی طرف راغب ہوئے اور مصنفین کو ان کی طلب پوری کرنی پڑی۔ ان میں نیاز۔ پریم چند۔ پطرس۔ رشید احمد صدیقی اور مجنوں گورکھپوری پیش پیش رہے اور ہندوستانیوں کے قومی، تمدنی، معاشرتی، اقتصادی، سیاسی، تاریخی اور سماجی حالات کو اجاگر کیا اور ان کی تحریروں کو پڑھ کر ہر شخص یہ سمجھنے لگا کہ "میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے۔" اور یہی وہ ادب ہے جو دنیا کے اور دوسرے عصری ادبیات کے مقابلے میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ ان لکھنے والوں میں اور بھی چند نام ہیں جن میں سجاد حیدر، سدرشن، اعظم کریوی، افسر میرٹھی، علی عباس حسینی، حامد علی خاں،

---

[1] افسانہ (مجنوں) صفحہ ۱۲۴۔ [2] مختصر تاریخ ادب اردو (اعجاز) صفحہ ۱۰۸۔

ایم اسلم اور عظیم بیگ چغتائی قابل ذکر ہیں۔ ان افسانہ نگاروں نے طرح طرح کی جدتیں اور رنگینیاں پیدا کی ہیں اور کر رہے ہیں۔ محبت اور عورت کے دلکش نظریوں پر بحث کی جا رہی ہے ان کے دو گروہ ہو گئے ہیں۔ پہلے گروہ میں نیاز مجنوں۔ سجاد حیدر اور ل۔ احمد ہیں۔ ان لوگوں نے زنانہ ادب لطیف کی بنیاد ڈالی اور ان کے نزدیک عورت۔

"محترم ترین مخلوق۔ ہم پر حکمرانی کرنے والی، ایک لذت ہے مجسم ایک تسکین ہے متشکل ایک سحر ہے مرئی ایک نور ہے مادی۔"

ان کے نزدیک عورت کا حسن صرف دیکھنے کے لیے ہے آزاد دمیدہ، آغوش سے دور۔ مجنوں کہتے ہیں محبت بلا ازدواج قایم رہ سکتی ہے اور اس میں مذہب وملت کی تفریق بے مقصد ہے۔ دوسرا گروہ عورتوں کو برائیوں کا خزینہ قرار دیتا ہے۔[1]

انھیں جھگڑوں سے تنگ آکر علامہ اقبال نے فرمایا تھا۔

ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس ؛ آہ بیچاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار

راشد الخیری، پریم چند، سدرشن اور سلطان حیدر جوش کے افسانوں کی عورتیں ہندوستانی ہیں جنکا خاص جوہر نسائیت ہے جو شرم وحیا کے مجسمے ہیں۔ پریم چند، سدرشن اعظم کریوی اور عظیم بیگ نے راجپوتنیوں کی عظمتیں بیان کرکے ہم پر ان کا سکہ بٹھا دیا۔ ان کا اپنی آن کے لیے سب کچھ قربان کر دینا۔ سب کچھ چھوڑ بیٹھنا لیکن بات کو بنائے رہنا اتنے موثر اور دلکش انداز میں بیان کیا گیا ہے کہ ہم داد دیے بغیر نہیں رہ سکتے۔ ان کی تکلیفوں میں ہم روتے ہیں اور ان کی خوشی کے موقع پر ہم بھی خوش ہوتے ہیں غرض ان کی تحریر پر ہم اس طرح چلتے ہیں گویا ایک گمراہ اندھیرے میں دور ٹمٹماتے دیے کی طرف چلا جاتا ہے۔

---

[1] ۔ ہمارے افسانے صفحہ ۵۹ اور دیباچہ رہگذار (مجموعہ افسانہ حامد علی خاں)

پریم چند نے عورتوں اور دوسرے ہر نقطۂ خیال کو اپنے افسانوں میں پیش کیا۔ سدرشن نے ہندوؤں کے گھرانے کی حالت کا خاکہ کھینچا اور راشد الخیری اور فضل حق قریشی نے مسلمانوں کے گھرانوں کی۔ حامد اللہ افسر نے ہندوستانیوں کے عام ذہنی رجحانات کو اپنے افسانوں کا پس منظر بنایا۔ اور پریم چند کے اصلاحی رنگ سے متاثر ہو کر سدرشن۔ اعظم کریوی۔ علی عباس حسینی اور پروفیسر مجیب نے کامیاب افسانے لکھے۔ افسر کا ڈالی کا جوگ علی عباس کا افسانہ آئی سی ایس۔ اور پروفیسر مجیب کے افسانوں میں کیمیا گر۔ باغی اور بیتھر نہایت کامیاب ہیں۔ کیمیا گر میں حکیم مسیح کا جذبۂ خدمت اور حب وطن۔ باغی میں بغاوت کے باریک نکات اور بڑے بابو کا کردار اور بیتھر میں ہندوستانیوں کا تساہل بڑی خوبی کے ساتھ ظاہر کیا گیا ہے اور افسانہ کا خاتمہ بھی پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ پروفیسر مجیب نے "روسی ادب" پر تفصیلی اور مبسوط تاریخ دو جلدوں میں لکھی ہے۔ روسی ادیبوں کا اثر بھی ان کے افسانوں پر نظر آتا ہے۔ پریم چند کی طرح وہ بھی واقعات بیان کرتے ہیں اور کرداروں کی سیرت نمایاں ہوتی جاتی ہے اور ان کی ساری زندگی پڑھنے والے کے سامنے آجاتی ہے۔ ان کے علاوہ اور بھی افسانہ نگار ہیں جن کا ذکر ہم نے اگلے باب میں کیا ہے۔ غرض اس طرح سارے ہندوستان کی تہذیب و تمدن کا مجموعی خاکہ ہمارے افسانوی ادب میں پیدا ہو گیا۔

ترقی پسند ادب | پریم چند اور عظیم بیگ نے انتقال کیا اور ان کے بالکل آخری زمانہ میں چند ایسے مصنفین منصۂ شہود پر آئے جو عصری میلانات کو شدت کے ساتھ اپنے افسانوں میں پیش کرنے لگے۔ ان کے گروہ کو ہم ترقی پسند مصنفین کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ یہ دور انتہائی حقیقت نگاری کا دور ہے جس میں زندگی بجلی کی طرح کوند رہی ہے اور سماج کی عمارت کی کڑیاں چٹخ رہی ہیں .... اب زندگی پر پردہ کم پڑا دکھائی دیتا ہے اور سمجھنے والے اسے بھی اٹھا دینے پر مصر معلوم ہوتے ہیں۔ وہ اپنے افسانوں میں

ہمیں بیک وقت مشین کی پوری پیچیدگی سے آشنا کردیتے ہیں سماج میں افراد کی جنسی اور معاشی کشمکش کو اس کے تعلقات کے ساتھ سمجھنا انھوں نے اپنا شعار بنالیا ہے۔ لیکن ان کے بعض اراکین اپنے افسانوں میں سماج کی اتنی عریاں تصویریں پیش کرتے ہیں کہ انھیں دیکھنا ثقہ طبیعت گوارا نہیں کرتی۔ ”نئے زاویے“ کے بعض افسانے رشید جہاں کا افسانہ (آصف جہاں کی بہو) عصمت چغتائی کی (ضدی) اور (لحاف) مثال کے طور پر پیش کیے جا سکتے ہیں اس سے ہمارے ادب میں ترقی کے امکانات کم ہیں اور ہمیں تو مایوسی ہی سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ مگر راجندر سنگھ بیدی اپنے افسانوں کے مجموعے (گرہن) کے دیباچے میں ہمیں یقین دلاتے ہیں۔

> ”ایک نیا اہم دور کٹھالی میں ہے۔ آندھی سے پہلے جو ایک خاص قسم کی امس ہوتی ہے اس کا ظہور ہمارے ادب میں بھی ہے اس میں کوئی بھی جنبش کوئی بھی زندگی کے آثار نظر نہیں آتے بلکہ ایک خاص قسم کے تخریبی و اتلافی رجحانات پیدا ہو رہے ہیں جن سے ہمیں قطعاً مایوسی کا اظہار نہیں کرنا چاہیئے۔ ترقی پسندی کے رسوائے عام نام کے تحت جو جنسی کیچڑ اچھالا جا رہا ہے اور جس سے لوگوں کو ادب کی صورت مسخ ہو جانے کا بے بنیاد اندیشہ ہے ایک ایسے ہی انحطاطی دور کی ترجمانی کرتا ہے لیکن۔
>
> اک ذرا صبر کہ فریاد کے دن تھوڑے ہیں۔۔

بیدی کی یہ تلقین اس لحاظ سے صحیح ہے کہ ترقی پسند ادیبوں میں اچھے اور برے سبھی شامل ہیں اور ان میں دن بدن اضافہ ہوتا جا رہا ہے بعض ارزاں شہرت کے متلاشی ہیں اور بعض کی نظر سماجی حالات پر گہری ہوتی ہے۔ موخرالذکر طبقہ واقعی طور پر ترقی پسند ادیبوں کے خوابوں کی تعبیر کو پورا کرے گا اور بیدی صاحب کا اشارہ غالباً اسی طرف ہے۔ ان ادیبوں کے افسانوں کے متعلق اردو ۴۰ء کے ایک نمبر میں شاہد لطیف نے لکھا ہے کہ اس نئے ادب سے بھوک اور نفسانیت کو نکال لیا جائے تو بہت کم باقی

بچے گا۔ اس تہی مائیگی کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ان میں سے اکثر نے ادب کے پرانے ذخیروں سے یک قلم منہ موڑ لیا ہے اور ان کو سرے سے قابل اعتنا نہیں سمجھتے۔ ادب لطیف اگست ۱۹۴۱ء میں ایڈیٹر صاحب لکھتے ہیں کہ "ہمارا ترقی پسند ادب بھی مغرب کی کورانہ تقلید میں زمین کو ضرورت سے زیادہ کریدنے لگا ہے وہ اس آسمان کو بالکل بھول جاتے ہیں جس پر سرمایہ ملت ٹیگور نے بھانکا جس کی وضاحت سرت چندر چیٹرجی نے اپنے لازوال افسانوں میں کی۔" ادب کو زندگی کا آئینہ ہونا یقیناً ضروری ہے اور اگر یہ نہ ہو تو ایسا ادب مجذوبوں ہی کے کام کا رہ جائے گا۔

اپنی تائید میں ہم ترقی پسند مصنفین کی جماعت کے ایک رکن اختر انصاری کے الفاظ پیش کرتے ہیں۔

"ادب کی دو خصوصیتیں ہیں ایک یہ کہ وہ اپنے دور کی اجتماعی زندگی سے ایک گہرا اور براہِ راست تعلق رکھتا ہو دوسرے یہ کہ اس کی تخلیق ایک مخصوص اور واضح سماجی مقصد کے ماتحت عمل میں آئے۔"[1]

منشی پریم چند کہتے ہیں۔

"ہم ادب کو تفریح اور تعیش کی چیز نہیں سمجھتے ہماری کسوٹی پر وہ ادب کھرا اترے گا جس میں تفکر ہو آزادی کا جذبہ ہو حسن کا جوہر ہو۔ تعمیر کی روح ہو زندگی کی حقیقتوں کی روشنی ہو جو ہم میں حرکت، ہنگامہ اور بے چینی پیدا کرے۔ سلائے نہیں کیونکہ اور زیادہ سونا موت کی علامت ہوگی۔"[2]

اس طرح ترقی پسند ادب کا نقطۂ نظر معلوم کرنے کے بعد ہم ان مصنفین کے کارناموں پر نظر ڈالیں گے جو اپنے آپ کو ترقی پسند ادیب سمجھتے ہیں اور سرسری طور پر معلوم کریں گے کہ وہ اپنے مقاصد کی کہاں تک تکمیل کر رہے ہیں۔

سجاد ظہیر کا نام سرفہرست ہے اس لیے کہ وہ انجمن کے پہلے معتمد ہیں انھوں نے

---

[1] نیا ادب مئی و جون ۱۹۴۱ء یا کتابچہ افادی ادب صفحہ ۴۔ [2] نیا ادب کیا ہے صفحہ ۴

اپنے دوران قیام یورپ میں فرانس کے مزدوروں کی بیداری، آسٹریا کا ناکام مزدور انقلاب اور بلغاریہ کی کمیونسٹ پارٹی کے ڈمیتروف کے مقدمہ کے واقعات دیکھے اور سُنے اور مغربی مصنفین کے ساتھ ساتھ خود بھی دمیتروف کی جرأت وہمت سے متاثر ہوئے اور اس طرح ترقی پسند مصنفین کی انجمن میں شریک ہو گئے (انگارے) کی کہانیوں کے بعد (بیمار)' (ایک ایکٹ ڈرامہ) اور (لندن کی ایک رات) ایک طویل مختصر افسانہ لکھا۔ ان کے دوسرے ساتھی احمد علی ہیں جو اپنے کام میں سرگرمی کے لحاظ سے سجاد ظہیر کے بعد آتے ہیں۔ سجاد ظہیر نے ہندوستان آکر ترقی پسند ادب کا پرچار کیا اور احمد علی کے علاوہ اور بھی ادیب اور شاعر انجمن کے مقاصد کی بلندیوں پر نظر رکھتے ہوئے رکن بن گئے۔ احمد علی کی تالیف (انگارے) ترقی پسند مصنفین کا پہلا کارنامہ ہے۔ (مہاوٹوں کی ایک رات) احمد علی کا افسانہ ہے جو بہت ادیبانہ شان کا حامل ہے۔ ڈاکٹر رشید جہاں، اختر انصاری۔ حیات اللہ انصاری، علی سردار جعفری، عصمت چغتائی، اختر حسن رائے پوری۔ سعادت حسن منٹو۔ کرشن چندر۔ اوپندر ناتھ اشک۔ راجندر سنگھ بیدی، ممتاز مفتی، ملک راج آنند، گوپال متل، فیاض محمود، علی عباس حسینی، پیرزادہ احمد ندیم قاسمی اور احتشام حسین یہ سب اسی کشتی کے سوار ہیں اور اپنے حسب مقدور کام کیے جا رہے ہیں۔ ان میں اختر رائے پوری، اختر انصاری، عصمت چغتائی، سعادت حسن منٹو، اشک، بیدی، حسینی اور قاسمی تیز نگار ہیں۔

"عصمت چغتائی، جنسی آزادی کی حامی ہیں ان کے پلاٹ ہمیشہ یکساں ہوتے ہیں پلاٹ۔ کرداروں کی تخلیق اور زبان وبیان میں سب ترقی پسند افسانہ نگاروں سے آگے ہیں اور ان کے جملے اس قدر بے ساختہ اور برجستہ ہوتے ہیں کہ کہانی بلند ہو جاتی ہے ان کا آرٹ حد درجہ بے باک اور خوفناک حد تک حقیقت پرست ہے"[1]

---

[1] اردو جولائی ۱۹۴۰ء۔

"اشک کا معمول ہے کہ یا تو وہ ایک خالص فنی چیز لکھتے ہیں یا پھر منشی پریم چند مرحوم کی طرح کسی سماجی برائی کو مرکز بنا کر اس کے گرد اپنی کہانی کا جال بنتے ہیں اور پڑھنے والے کے دل و دماغ پر اس برائی کا ایسا گہرا اثر ڈالتے ہیں جو مدتوں محو نہیں ہوتا" [1]

"اختر انصاری جس نقطۂ نظر سے سماج کے مناظر کو دیکھتے ہیں اسی طرح پیش کرتے ہیں تصنع نہ ان کے بیان میں ہے نہ اسلوب میں۔ رومان جس نے آج کل ادب کو گندہ کر رکھا ہے ان کے ہاں اس کا دخل نہیں" [2]

"بیدی کا رجحان تحلیلی ہے وہ اپنی کہانیوں میں پنجاب کی زندگی اور اس کے رسم و رواج اور ان کی اصلاح پر زور دیتے ہیں۔ بیدی زندگی کے تجربوں کو صرف نئی شکل میں نہیں بلکہ زیادہ موثر شکل میں پیش کر رہے ہیں۔ سماج کی ناجائز پابندیوں سے ان کی بغاوت دھیمی آنچ کی طرح کھیل رہی ہے۔ اور جب کسی کسی جگہ شعلہ کی لپک اٹھتی ہے تو اس کی روشنی میں بہت محل گرتے دکھائی دیتے ہیں" [3]

"حسینی رنگینی پیدا نہیں کرتے بلکہ وہ خود بخود پیدا ہوتی ہے۔ دیہات سے متعلق افسانوں کے موضوع میں بلا کا طنز اور اس کے اظہار میں قیامت کی صناعانہ نازک آفرینی سے کام لیا گیا ہے۔ زبان کی نرمی افسانے کو کہانیوں کی طرح پرکیف بناتی ہے۔ منٹو کا تنوع۔ مشاہدہ زبان و بیان کی لطافتیں سب میں ایک پختہ کار افسانہ نگار کی شان ہے۔ ان کے ہر افسانے میں ایک نیا موضوع ملتا ہے" [4]

دیگر اراکین میں بھی کم و بیش یہی صفات پائی جاتی ہیں جن کی مشق زیادہ ہوتی جا رہی ہے ان کی نظر سطحی نہیں رہی بلکہ وہ سماج کی تاریکیوں میں دیے جلا رہے ہیں اور وہ دن دور نہیں کہ ان کی کوششیں بارآور ثابت ہوں۔

---

[1] ۔ سالنامہ ادبی دنیا ۴۰ء۔ [2] ۔ اردو ۴۱ء۔ [3] ۔ نیا ادب مئی ۴۱ء۔ [4] ۔ نیا ادب ستمبر ۴۵ء۔

افسانہ کی ساخت ۔خارجی پہلو | ساخت کے اعتبار سے افسانے کے دو پہلو ہیں ایک خارجی اور دوسرا داخلی ۔خارجی پہلو سے مراد افسانہ کا سرسری خاکہ جس پر افسانہ کی بنیاد کھڑی کی جاتی ہے اور داخلی پہلو سے مراد اس کا خاکہ ۔ کردار ۔ اسلوب ۔ زبان ۔موضوع الفاظ کا استعمال اور ہر وہ خوبی جو افسانہ کو موثر اور دلچسپ بنا سکے ۔ اس کے بنیادی عناصر آغاز افسانہ ۔مقصد کی یک نظری یا افسانہ نگار کا نقطۂ خیال کشمکش ۔ منتہا اور خاتمہ ہیں ۔

افسانہ کی ابتدا اور انتہا | افسانہ کی ابتدا جتنی اچھی ہوگی پڑھنے کے لیے لوگ اسی قدر راغب ہوں گے اور پہلی سطر سے دوسری سطر کی طرف رغبت ہوگی ۔طول طویل تمہید یا موقع و محل کے مناظر اب افسانہ کی ابتدا کے لیے سم قاتل کا حکم رکھتے ہیں ۔ دوسری بات یہ ہے کہ افسانہ نگار ابتدا کے بعد اپنا مقصد واضح کردے کہ وہ اپنے کرداروں سے کیا کام لینا چاہتا ہے تیسری چیز کرداروں کے خیالات کا لحاظ اور پھر اس کی انتہا جہاں پڑھنے والا یہ سمجھ سکتا ہے کہ اختتام کس طرح ہوگا اس کے بعد خاتمہ بھی اسی طرح اچانک ہوگا ۔ اس لیے کہ جب قاری نے تصفیہ کرلیا ہے کہ آگے یہ انجام ہونے والا ہے تو اس کو زیادہ انتظار میں رکھنا افسانہ کی خامی کے مرادف ہوگا ۔بعض اچھے افسانہ نگار اپنے افسانے اس طرح ختم کرتے ہیں کہ پڑھنے والا اس شبہ میں رہتا ہے کہ ابھی افسانہ اور باقی ہے حالانکہ وہ اپنا مقصد اور نقطۂ نظر اپنے کرداروں کے ذریعہ ظاہر کرچکتے ہیں ۔ یہ بھی ضروری ہے کہ بڑھتی ہوئی دلچسپی کے ساتھ باہمی ربط قایم رہے ورنہ جہاں سے لغزش ہوگی وہاں افسانہ خوان کی دلچسپی ختم ہو جائے گی ۔

داخلی پہلو | داخلی حیثیت سے پلاٹ کا بہتر ہونا ضروری ہے اور اس کے لیے اکتساب سے زیادہ قابلیت کی ضرورت ہے جس کا مطالعہ وسیع اور جس کی نظر گہری ہوگی وہ آسانی سے پلاٹ بنا سکتا ہے ۔لیکن اس کو حسب موقع پھیلانا اور سنوارنا بھی ضروری ہے اور اس کے لیے خاص سلیقہ کی ضرورت ہے ۔ دوسرا جز کردار نگاری ہے ۔" یہ کہدیا جاتا ہے کہ

کرداروں کو جیتی جاگتی تصویریں ہونا چاہئے انسانی کردار کی صحیح نقلیں ہی جیتی جاگتی تصویریں ہو سکتی ہیں۔ صاحبِ کمال کردار نویس وہی مصنف سمجھا جاتا ہے۔ نقل کو اصل کر دکھائے۔ واقعات کردار کو ابھارتے ہیں یہ قانون فطرت ہے[۱]"

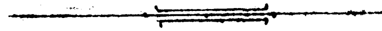
انسان کی نفسیاتی قسموں کی کردار کشی کرنے والے مصنف زیادہ کامیاب ہوتے ہیں کرداروں کا اعلیٰ خصوصیات کا حامل ہونا نہایت ضروری ہے پڑھنے والا کرداروں کے ساتھ ساتھ چلتا ہے بشرطیکہ کرداروں میں لے چلنے کی قوت ہو۔ اگر ان کی قوت زائل ہو جائے تو افسانہ شتر بے مہار بن جائے گا۔ افسانے کا ارتقاء بھی تدریجی ہونا ضروری ہے۔ اس کی زبان میں حلاوت اور شیرینی ہونی چاہئے اسلوب بیان بھی افسانے میں خاص اہمیت رکھتا ہے اگر خدا داد ملکہ ہو تو پھر افسانہ نگار کے وارے نیارے ہیں اور نہ ہو تو اکتساب سے کچھ حاصل ہو جاتا ہے۔ "تمثیلی رنگ یعنے ڈرامائی انداز بھی خاص اہمیت رکھتا ہے[۲]" لیکن لطیف الدین احمد اکبرآبادی اس کو غیر اہم سمجھتے ہیں[۳]۔ ممکن ہے وہ اس سے گفتگو اور بحث و تمحیص مراد لیتے ہوں لیکن اس کا مطلب یہ ہے کہ قاری افسانہ پڑھتا ہے لیکن طرز تحریر اس کو ایسے مناظر بتاتی ہے جس کو وہ حقیقت سمجھتا ہے۔ عبارت پڑھ کر وہ ہنستا بھی ہے اور عبارت ہی پڑھ کر وہ اپنے رخساروں پر گنگا جمنا بہتے دیکھتا ہے یہی افسانہ نگار کی سحر کاری ہوتی ہے

کم سے کم الفاظ کا استعمال بشرطیکہ مفہوم میں الجھن نہ ہو زور بیان اور طرز ادا میں زبان کی گھلاوٹ اور روانی الفاظ کا انتخاب اور فقروں کا دروبست افسانے کے حسن میں اضافہ کرتے ہیں۔ افسانہ نگار اپنے افسانے کو خواہ مختصر لکھے یا طویل اس کی طرز ادا اور زبان اس کی کامیابی اور ناکامی کی ذمہ دار رہتی ہیں۔ اسی سے کشش

---

۱ : سالنامہ ساقی ۴۸ء۔ ل احمد۔ ۲۔ دنیائے افسانہ۔ ۳۔ سالنامہ ساقی ۴۸ء۔

قایم رہتی ہے۔ حقیقت نگاری اور مکالمہ بھی جو و لازم ہیں۔ اگر افسانہ نگار حقیقت سے دور ہو جائے تو پھر وہ مافوق الفطرت اشیاء کا ذکر کرے گا جس کا زمانہ گذر چکا۔ مکالمہ سے تحریر میں کمی ہو جاتی ہے اور کردار کو سمجھنے میں بہت زیادہ سہولت ہوتی ہے۔ بہر حال افسانہ نویس سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ ایک کامیاب مقرر کی طرح پہلے ہی فقرے سے قاری کی توجہ کو اپنی گرفت میں لے لے اور پھر جوں جوں افسانے کو بڑھائے اپنے ناظر کی دلچسپی میں اضافہ کرتا جائے حتیٰ کہ کلائمکس پر پہنچ کر اس طرح افسانے کو ختم کر دے کہ جو اثر وہ قاری پر ڈالنا چاہتا ہے وہ تمام تر شدت کے ساتھ اس پر مسلط ہو جائے۔



چوتھا باب ۔ پریم چند کے موضوع

مقصد افسانہ نگاری | پریم چند نے تقریباً ہر موضوع پر قلم اٹھایا ہے اور جس موضوع پر انھوں نے لکھا اس کو معراج کمال تک پہنچا دیا ان کے افسانوں سے اگر ان کے خیال یا موضوع کو الگ کر لیا جائے تو سارے افسانے بالکل بے رنگ اور تلخ ہو جائیں۔ ان کی افسانہ نگاری کا مقصد ہی یہ تھا کہ اپنی معاشرت اور تمدن کے نقایص کو پیش کیا جائے اور ان کی ممکنہ اصلاح کی جائے۔ ان کے اس جذبہ خدمت نے ان کے قلم سے ایسی ایسی چیزیں لکھوائیں جو اردو ادب کی زندگی تک ہمیشہ بہ نظر استحسان دیکھی جائینگی۔

ان کے افسانوں کے مطالعہ کے بعد ہمارے ذہن میں مختلف خیالات گھومتے ہیں کبھی ہم انھیں راجپوتوں کے دربار کا نیم تاریخی داستان گو سمجھتے ہیں اور کبھی دیہاتیوں کا دردمند، کبھی مصور فطرت اور کبھی رفارمر، کبھی ہم انھیں ہندوستان کے رسم و رواج کو قید و بند سے آزاد کرانے والا رہنما پاتے ہیں اور کبھی بازار حسن کا گرگ باران دیدہ سمجھنے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ غرض وہ ہر رنگ کی تصویر کھینچتے ہیں جو اتنی دلکش ہوتی ہے کہ ہماری نظریں ہٹائے نہیں ہٹتیں یہی مصور کی کامیابی کا راز ہے۔ تصویر پر کسی نے گہری نظر ڈال لی تو مصور کی محنت ٹھکانے لگ گئی پریم چند کی تصویریں بھی دلکش اور نظر افروز ہیں وہ اپنے مقصد میں ناکام نہیں رہے۔

ازدواج بیوگان | ان کے مختلف موضوعات کو جن کا تعلق سماج اور معاشرت سے ہے ہم مقامی رنگ سے تعبیر کریں گے۔ کوئی ناول اور کوئی افسانہ اس سے خالی نہیں نظر آتا۔ رسم و رواج کی بندشیں انھیں طائر قفس بنا دیتی ہیں۔ اور وہ اسی کیفیت سے متاثر ہو کر

اپنا پہلا ناول (ہم خرما و ہم ثواب) لکھتے ہیں۔ دھنک دھاری لال کی تقریر کا یہ حصہ ان کے ناول کی بنیاد ہے۔

"حضرات سب خرابیوں کی جڑ ہماری لاپروائی ہے۔ ہماری حالت بالکل نیم جان مریض کی سی ہے جو دوا کو ہاتھ میں لے کر دیکھتا ہے مگر منہ تک نہیں لے جاتا۔ ہاں صاحبو ہم آنکھیں رکھتے ہیں مگر اندھے ہیں ہم کان رکھتے ہیں مگر بہرے ہیں ہم زبان رکھتے ہیں مگر گونگے ہیں۔ اب وہ زمانہ نہیں ہے کہ ہم کو اپنی معاشرت کے نقائص نظر نہ آتے ہوں۔ ہم تمام اچھی باتوں کو جانتے ہیں اور مانتے ہیں ——— مگر جس طرح مسائل اخلاقی پر ایمان رکھ کر بھی گمراہ ہوتے ہیں خدا کے وجود کے قائل ہو کر بھی منکر بنتے ہیں اسی طرح اصلاح تمدن سے اتفاق رکھتے ہیں مگر ان پر عمل نہیں کرتے"[1]

امرت رائے ناول کے ہیرو مغربی تعلیم یافتہ ہیں اور اپنے قدیم رسم و رواج کے بندھنوں کو توڑنے کا عزم کرتے ہیں ودھوا آشرم کی بنا ڈالتے ہیں اس کو کامیابی سے چلا کر اپنے مقصد میں کامیاب ہوتے ہیں۔ اس ناول میں پریم چند نے ازدواج بیوگان پر بہت زور دیا ہے اور بیوہ کے نکاح بعد کا دلنشیں انداز میں خاکہ کھینچا ہے۔ مثلاً وہ رام کلی کے متعلق اس کے نوعمری میں بیوہ ہونے، شباب کی تمناؤں کو پامال ہونے اور جذبات کی طوفانی دھارا سے ضبط نفس کا بند ٹوٹنے کی تصویر ان الفاظ میں کھینچتے ہیں۔

"اس کا نام رام کلی تھا بیچاری دو برس سے رنڈاپا بھوگ رہی تھی اس کا سن بھی مشکل سے سولہ سترہ برس کا ہوگا چہرہ مہرہ بھی برا نہ تھا خط و خال نہایت دلفریب۔ اگر پورنا (ایک لحاظ سے ہم خرما و ہم ثواب کی ہیروئن) آم کی طرح زرد تھی تو اس کا چہرہ جوش جوانی سے گلابی ہو رہا تھا۔ بال میں تیل نہ تھا نہ آنکھوں میں کاجل۔ نہ مانگ میں سیندور نہ دانتوں میں مسی تاہم اس کی آنکھوں میں وہ شوخی تھی۔ چال میں وہ لچک اور ہونٹوں پر وہ تبسم جس سے ان بناوٹی آرائشوں کی ضرورت باقی نہ تھی وہ مٹکتی ادھر ادھر تاکتی مسکراتی چلی جا رہی تھی۔.... راستہ میں ہزاروں آدمی ملے سب کی نظریں ان دونوں عورتوں (رام کلی اور پورنا) کی طرف پڑتی تھیں۔ فقرے چست کیے جاتے تھے مگر پورنا سر کو اوپر اٹھاتی ہی نہ تھی ہاں رام کلی البتہ مسکرا مسکرا کر معشوقانہ انداز سے ادھر ادھر دیکھتی تھی ایک آدھ برجستہ جواب بھی دیتی"[2]

---

[1] ہم خرما و ہم ثواب صفحہ ۳۔

اس کے بعد رام کلی کے عادات و اطوار جس انداز میں بیان کیے گئے ہیں وہ نہایت طنز یہ اور چبھتے ہوے ہیں لڑکیوں کا اپنے عنفوان شباب سے پہلے بیوہ ہوجانا کلی کھلنے سے پہلے مرجھانے کے مرادف ہے اب ایسی دیویاں ہندوستان میں ضرور ہیں جنھوں نے اپنی ساری جوانی بیوگی میں کاٹ دی اور ایسی بھی بہت سی ملیں گی جو پیٹ کے الاؤ اور نفسانی خواہشات کے مارے بیوگی کی مصیبت کو برداشت نہ کرسکیں بظاہر بیوہ رہیں اور باطن میں سہاگن۔ پریم چند سماج کو اسی عیب سے بچانے کے لیے ازدواج بیوگان کے حامی تھے۔

رام کلی اور پورنا دو متضاد خیالات کے کردار ہیں رام کلی کی بیوگی میں لغزش ہوتی نظر آرہی ہے اور پورنا نے اپنی جوانی اپنے شوہر کے نام کی مالا جپتے ہوئے کاٹنے کا عزم کیا ہے۔ مگر کمزور عورت کے دل پر مختلف اثرات ڈالے گئے اور وہ امرت رائے (ہیرو) کی محبت کا شکار ہو گئی۔ اور ان سے شادی کرلی۔ اسی طرح رام کلی اور اس کے ساتھ لچھمی نے بھی دوسرا عقد کرلیا۔

اس سلسلے میں پریم چند نے اور بھی بہت سی برائیوں کو آشکار کیا ہے۔ بیوہ اور خاص طور پر نوعمر بیوہ کا سماج میں کوئی درجہ نہیں ہوتا۔ وہ نہایت حقیر اور منحوس سمجھی جاتی ہے۔ صبح اٹھنے کے بعد اس کی صورت کا نظر آنا شگون بد خیال کیا جاتا رہا ہے۔ اس کو خوشی کی تقریب میں دور دور رہنا پڑتا ہے اور یہ اس کی خود داری پر ٹھیس لگانے کے لیے بہت کافی ہے۔ اسی پر بس نہیں ہوتا بلکہ اس کی ساری دلچسپیاں ختم ہو جاتی ہیں۔ وہ سارے خاندان کی لونڈی اور خادمہ سمجھی جاتی ہے۔ اس کے بعد ساس کراماً کاتبین کی طرح اس کی ہر حرکت کی نگراں ہوتی ہے اور بے قصور بھی غریب بیوہ گالیاں اور جوتیاں کھاتی رہتی ہے۔ ہندوستانی سماج میں بہت کم بیوائیں ایسی ہوں گی جنھیں ان صعوبتوں سے دوچار ہونا نہیں پڑا ورنہ نوّے فیصد انھیں پابندیوں کی شکار رہیں ان تمام جزئیات کو پریم چند نے رام کلی کے مصائب میں ظاہر کیا ہے۔

یہی ناول ہندی میں "کشنا" اور کچھ اضافہ سے "پرتگیا" اور "پریما" کے نام سے اور اُردو میں دوسرے لباس میں "بیوہ" کے نام سے شایع ہوا لیکن زیب داستان کے لیے اس میں اکثر جگہ حاشیہ آرائی کی گئی ہے۔ کردار تقریباً وہی موجود ہیں اور اپنا اپنا کام برابر انجام دیتے ہیں۔ یہ پریم چند کی وہ تصویر ہے جس پر انھوں نے نظر ثانی کی ہے۔ اس لیے یہ نقش ثانی کا درجہ رکھتی ہے۔ ایک خاص بات اس کتاب میں ہمیں یہ نظر آتی ہے کہ پریم چند نے اس میں ہیرو امرت رائے کو بنایا مگر ہیروئن کبھی پریما بن جاتی ہے اور کبھی پورنا اور پڑھنے والا کوئی تصفیہ کرنے نہیں پاتا۔

اس کتاب کو انھوں نے اُردو میں بھی لکھا اور ہندی میں بھی۔ ایک مرتبہ نہیں بلکہ دو مرتبہ لکھا۔ اس موضوع پر انھوں نے نہ صرف لکھا بلکہ اس پر عمل بھی کیا اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ازدواج بیوگان کے وہ کس قدر حامی تھے، اور طرح طرح سے اس کا پرچار کرنا چاہتے تھے۔

اُن کا ایک دلنشیں افسانہ "مالکن" (واردات) بھی ہے۔ یہ مالکن رام پیاری ہے جو اتفاق سے عین عالم شباب میں بیوہ ہو جاتی ہے۔ افسانہ ان الفاظ سے شروع ہوتا ہے۔

> "شیو داس نے بھنڈار کی کنجی اپنی بہو رام پیاری کے سامنے پھینک دی اور آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا، "بہو آج سے گرہستی کی دیکھ بھال تمہارے ذمہ ہے میرا سکھ بھگوان سے نہیں دیکھا گیا نہیں تو کیا جوان بیٹے کو یوں چھین لیتے۔"

مالکن کے احساس نے رام پیاری کا غم غلط کر دیا۔ دیہات میں مالکن بڑی با اختیار عورت ہوتی ہے۔ دکن کے دیہات میں یہ "کاروبارنی" کہلاتی ہے اور چودھری کے لیے کاروباری استعمال کرتے ہیں۔ رام پیاری کو جب یہ عہدہ ملا تو اس نے اپنے خسر اور دیور اور دیورانی (جو اس کی حقیقی بہن بھی تھی) کی خدمت میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی لیکن پیسے کے معاملے میں ہمیشہ محتاط رہی۔ چھوٹی بہن کو خسر کے انتقال کے بعد احساس کمتری نے ورغلایا اور وہ میاں بیوی معہ اپنے بچوں کے تلاش معیشت میں کلکتہ روانہ ہوئے اور رام پیاری سے جان چھڑالی

وہ اکیلی رہ گئی اور زراعتی کاروبار کے لیے اس کو کافی فرصت ملنے لگی۔ اس کا ملازم جوکھو بن بیاہا تھا۔ رام پیاری اکثر اس سے شادی کرنے کو کہتی اور جوکھو ٹال جاتا۔ آخر جب اُس نے زیادہ مجبور کیا تو جوکھو نے کہا۔

"اچھا تو سنو میں چاہتا ہوں کہ وہ (میری دلہن) تمہاری طرح ہو، ایسی ہی لجانے والی ہو، ایسی ہی بات چیت میں ہوشیار ہو، ایسا ہی اچھا کھانا پکاتی ہو، ایسی ہی کفایت شعار ہو، ایسی ہی ہنس مکھ ہو۔ بس ایسی مورت ملیگی تو بیاہ کروں گا نہیں تو اسی طرح پڑا رہوں گا۔" پیاری کا چہرہ شرم سے سرخ ہو گیا پیچھے ہٹ کر بولی تم بڑے دلگی باج ہو ہنسی ہنسی میں سب کچھ کہہ گئے۔" ان الفاظ پر افسانہ ختم ہو گیا ہے اور پریم چند نے باتوں باتوں میں اپنے مطلب کی بات بھی بیان کر دی ہے۔

"نئی بیوی" (واردات) میں پریم چند نے بے جوڑ شادیوں کے نتائج کا اظہار کیا ہے ان شادیوں میں عورت بوڑھے شوہر سے محبت نہیں کر سکتی وہ ہمدردی کر سکتی ہے۔ بیٹی کی طرح چاہ سکتی ہے یا ملازمہ کی طرح خدمت کر سکتی ہے مگر بیوی بن کر اپنے شوہر سے محبت نہیں کر سکتی۔ یہ افسانہ نہیں بلکہ حقیقت ہے اور پریم چند کی تصویریں بے حد رنگین اور دلاویز ہیں۔

حاکموں کا کردار | پریم چند نے اپنے افسانوں میں عہدہ داروں اور ماتحتوں کے کردار کا بھی نقشہ نہایت صحیح انداز میں کھینچا ہے۔ مطالعہ کے بعد یہ محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے ان دونوں کے کسی پہلو کو نہیں چھوڑا۔ حاکم اور محکوم دونوں کے ذہنی تفاوت کی مثالیں پریم چند کے افسانوں میں دن کی طرح روشن ہیں۔ حاکم کی فرعونیت اور بد دماغی کے ایسے ایسے واقعات نظر آتے ہیں کہ اس کے انسان ہونے پر شک ہونے لگتا ہے۔ بعض وقت ہمیں دھوکہ ہوتا ہے کہ یہ افسانہ ہی تو ہے، جو کچھ لکھیں تھوڑا ہے لیکن پریم چند کے کرداروں جیسے فرعون بے سامان حاکموں کی بھی دنیا میں کمی نہیں جنھیں ملازمت کا دُور سے بھی واسطہ ہے وہ ان کی فرعونیت سے واقف ہو سکتے ہیں۔

"استعفیٰ" (پریم چالیسی اول) میں ایک حاکم اور ایک محکوم کے کردار کو ظاہر کیا گیا ہے۔ فتح چند دفتر میں کلرک تھے۔ صبح کے گئے شام کو لوٹے کہ پھر چپراسی نے آکر دستک دی اور کہنے لگا

صاحب نے بلایا ہے یہ بنگلے پر پہنچے، صاحب غصہ میں بھرے ہوئے نشہ کی حالت میں بیٹھے تھے، فتح چند کو دیکھتے ہی کچھ مغلظات سنائیں اور چپراسی سے ان کا کان پکڑنے کو کہا۔ مگر وہ صاف انکار کر گیا۔

"صاحب اب غصہ ضبط نہ کر سکے ہنٹر لے کر دوڑے چپراسی نے دیکھا، یہاں کھڑے رہنے میں خیریت نہیں ہے تو بھاگ کھڑا ہوا۔ فتح چند ابھی تک بے حس وحرکت کھڑے تھے، صاحب نے چپراسی کو نہ پایا تو ان کے پاس آئے ان کے کان پکڑ کر زور سے ہلا دیے اور کہا "تم سور۔ گستاخی کرتا ہے جا کر آفس سے فائل لاؤ۔ فتح چند نے کہا کونسا فائل لاؤں حضور۔

صاحب ۔ فائل فائل اور کونسا فائل تم بہرا ہے سنتا ہے ہم فائل مانگتا ہے۔

فتح چند نے کسی قدر دلیر ہو کر کہا "آپ کونسا فائل مانگتے ہیں"

صاحب ۔ وہی فائل جو ہم مانگتا ہے وہی فائل لاؤ ابھی لاؤ

یہ ہے حاکم ومحکوم کی گفتگو دونوں ایک ہی حکومت کا دیا کھاتے ہیں دونوں ایک ہی حکومت کے غلام ہیں اور دونوں پر ایک ہی قانون چلتا ہے مگر فرق صرف حاکم ومحکوم کا ہے۔ حاکم سمجھتا ہے کہ اس کا محکوم اس کا زرخرید غلام ہے اور یہ ہندوستان کے نوّے فیصد حاکموں کا نقشہ ہے۔

ایک جگہ پولیس والوں کے کردار کا نقشہ اس انداز میں کھینچتے ہیں۔

"یہ پولیس لائن ہے۔ یہاں پولیس والے قواعد کرتے ہیں۔ رائٹ۔ لیپ۔ پھام پھو۔ نوری نے تصحیح کی۔ کیا کہا یہ پولیس والے پہرہ دیتے ہیں، جب ہی تمھیں بہت خبر ہے۔ اجی حضرت یہ لوگ چوریاں کراتے ہیں۔ شہر کے جتنے چور ڈاکو ہیں سب ان سے ملے رہتے ہیں رات کو یہ سب ایک محلہ میں تو چوروں سے کہتے ہیں چوری کرو اور دوسرے محلے میں پکارتے ہیں جاگتے رہو جاگتے رہو۔ (عید گاہ ۔ دودھ کی قیمت)

پولیس اور رعایا دونوں میں حاکم ومحکوم کا تعلق ہے۔ اور پریم چند نے اکثر مقامات پر پولیس والوں کے راز بے نقاب کیے ہیں۔" (غبن) میں بھی جابجا لطیف اشارے ہیں اور شاید ہی کوئی ایسی

بات ہو جو ان سے فروگذاشت ہو گئی ہو۔ اپنے ایک افسانے میں انھوں نے داروغہ جی کا خاکہ کھینچا ہے۔

"داروغہ جی نہایت کارگذار افسر تھے گالیوں سے بات کرتے تھے۔ صبح کو چارپائی سے اٹھتے ہی گالیوں کا وظیفہ پڑھتے (دورے کے سلسلے میں وہ ایک گاؤں میں پہنچے) سارے گاؤں میں ہلچل پڑ گئی تھی کانسٹبل اور چوکیدار راستوں پر یوں اکڑتے چلتے تھے گویا اپنی سسرال میں آئے ہیں" ("اندھیر" پچیسی دوم)

رشوت ستانی | اگر ہم ان واقعات کا غائر مطالعہ کریں تو اس میں صداقت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی نظر آئے گی ان واقعات کے ساتھ ہمیں عہدہ داروں کی رشوت ستانی کا خیال آتا ہے۔ اور دست غیب سے جو حق تلفی اور ناانصافی ہوتی ہے اس کی پول کھلتی ہے۔ ادھر پریم چند ملازم ہوئے اور انھیں ملازمین سرکار کے کردار کا اندازہ ہونے لگا۔ وہ خود تو بیچارے تعلیمات میں تھے کچھ زیادہ پتہ بھی نہ چلتا مگر "سوز وطن" کی اشاعت نے انھیں بری طرح پھنسا دیا اور مختلف عہدہ داروں سے سابقہ پڑا اس میں پولیس کے لوگ بھی تھے اور مالگزاری کے بھی تعلیمات کے بھی تھے اور نظم ونسق (سیاسیات) کے بھی اس سے ان کی نظریں وسیع ہو گئیں۔ وہ رشوت کو نہایت حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے ممکن ہے کہ ان پر انگور کھٹے ہیں والی مثل صادق آتی ہو مگر ان کے خیالات اتنے پاکیزہ ہیں کہ دل پر اثر کر جاتے ہیں وہ اس کا واحد حل یہ بتاتے ہیں کہ "جب تک چھوٹے آدمیوں کی تنخواہ اتنی نہ ہو جائے گی کہ وہ بھلمنسی کے ساتھ نباہ کر سکیں تب تک رشوت بند نہیں ہو سکتی" تنخواہ بڑھنے کے بعد شاید غریب رشوت لینا بند کر دے لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ رشوت کیسے بند ہو گی جو بڑی تنخواہوں والے مختلف طریقوں سے اپنے نام اور تنخواہ کے تناسب کا لحاظ کرتے ہوئے لیتے ہیں۔ ان کا ایقان تھا کہ مفت کی دولت تنہا ہضم نہیں ہوتی اور اس بنیاد پر انھوں نے اپنا ایک افسانہ بھی گھڑا کیا اور یہی افسانہ بڑھتے بڑھتے "بازار حسن" بن گیا۔ وہ لکھتے ہیں۔

"پنڈت کرشن چندر نے رشوت لی مگر انھیں یہ معلوم نہ تھا کہ مالِ حرام تنہا مشکل سے ہضم ہوتا ہے مختار نے سارا بھانڈا پھوڑ دیا اور خفیہ طور پر تحقیقات بھی ہوگئی اور عین لڑکی کی شادی کی رسموں کے آغاز کے وقت سپرنٹنڈنٹ کئی کانسٹبلوں کے ساتھ آئے ایک سب انسپکٹر نے جیب سے گرفتاری کا وارنٹ نکال کر کرشن چندر کو دکھایا ان کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ ایک سکتے کی حالت میں سر جھکا کر کھڑے ہوگئے۔ ان کے چہرہ پر خوف نہ تھا۔ ندامت تھی۔ یہ وہی دونوں سب انسپکٹر تھے جن کے سامنے وہ غرور سے گردن اٹھا کر چلتے تھے جنھیں وہ حقیر سمجھتے تھے۔ ساری عمر کی نیکنامی خاک میں مل گئی نفس نے کہا اب اپنے اعمال کا خمیازہ اٹھاؤ میں نہ کہتا تھا کہ آگ میں نہ کودو تم نے میرا کہا نہ مانا اگر تم نے کسی معمولی خاندان میں شادی کرنے پر قناعت کی ہوتی تو آج یہ نوبت کیوں آتی مگر تمہیں اپنی عزت اور وقار کی پڑی تھی تو اب اس سودائے خام کا مزہ چکھو"[1]

پریم چند نے اس سودائے خام کا مزہ بڑی بری طرح چکھایا۔ قصہ کی اصل بنیاد یہی ہے کہ پنڈت کرشن چند نے اپنی لڑکی کو زیادہ جہیز دینے کی خاطر صرف ایک دفعہ گرانقدر رشوت لی اور اس کو بچا نہ سکے۔ اس کے بعد انھیں برسوں جیل میں رہنا پڑا اور پھر لڑکیوں کی جو درگت بنی وہ الگ۔

ان کا ناول (غبن) بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے وہاں نئی بیوی کے لیے زیور بنانے کی خواہش نے اُما کو زیادہ سے زیادہ رشوت لینے پر مجبور کیا، پھر غبن کا بے بنیاد الزام اپنے سر لے کر کلکتہ بھاگ کھڑا ہوا اور دیبی دین کے گھر میں پناہ لی۔ لیکن ناول کے آخری حصہ میں اُما کی بیوی کی زبان سے وہ کہلواتے ہیں۔

---

[1] بازارِ حسن اول صفحہ ۱۳۔

"بہ ہیں نہیں کہتی کہ عیش و آرام سے میرا جی بھر گیا یا گہنے کپڑے میں او پ گئی یا سیر تماشے سے مجھے نفرت ہے۔ یہ ساری تمنائیں جوں کی توں ہیں اگر تم اپنی قوت بازو سے، اپنی جانفشانی سے انھیں پورا کر سکو تو کیا کہنا، لیکن نیت کھوٹی کر کے یا ضمیر کا خون کر کے ایک لاکھ بھی لاؤ تو میں اسے ٹھکرا دوں گی"[1]

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ پریم چند نے عورتوں کو زیادہ نیک نفس بتایا ہے اور مردوں کو حریص۔
"نمک کا داروغہ" (پریم پچیسی اول) ان کا وہ افسانہ ہے جس کو وہ اپنے بہترین افسانوں میں شامل کرتے ہیں۔ اس کی بنیاد بھی رشوت پر ہے۔ داروغہ کے والد نے اپنے بیٹے بنسی دھر کو تلاشِ ملازمت کے لیے جاتے وقت سمجھایا۔

"ایسا کام ڈھونڈنا جہاں کچھ بالائی رقم کی آمدنی ہو۔ ماہوار مشاہرہ پورنماشی کا چاند ہے جو ایک دن دکھائی دیتا ہے اور پھر گھٹتے گھٹتے غائب ہو جاتا ہے۔ بالائی رقم بہتا ہوا سوتا ہے جس سے پیاس ہمیشہ بجھتی رہتی ہے مشاہرہ انسان دیتا ہے اسی لیے اس میں برکت نہیں ہوتی اور تم خود عالم و فاضل ہو تمہیں کیا سمجھاؤں یہ معاملہ بہت کچھ ضمیر اور قیافہ کی پہچان پر منحصر ہے"

بنسی دھر نمک کے داروغہ بن گئے اور جب سیٹھ الوپی دین کی گاڑیاں بغیر محصول ادا کیے جانے لگیں تو گرفتار کر لیا۔

"پنڈت الوپی دین کو مبلغ علیہ السلام کی طاقت کا پورا پورا عملی تجربہ تھا، وہ کہا کرتے تھے کہ دنیا کا ذکر ہی کیا، دولت کا سکہ بہشت میں بھی رائج ہے اور ان کا یہ قول بہت صحیح تھا، قانون اور حق و انصاف یہ سب دولت کے کھلونے ہیں جن سے وہ حسب ضرورت اپنا جی بہلایا کرتی ہے"

---

[1] (غبن) صفحہ ۲۸۶۔

مگر الوپی دین کو بنسی دھر کی دیانت ۔۔۔ نیچا دکھا دیا۔ انھوں نے حق و صداقت کو نہ چھوڑا اور چونکہ حق تلخ ہے، اس لیے انھیں حق کہہ کر معطل ہونا پڑا۔ لیکن اسی سانچ کو آنچ نہیں، جب الوپی دین کو مختارکل کی تلاش ہوئی تو ان کی نگاہ انتخاب بنسی دھر ہی پر پڑی۔

"مشعل ہدایت" (پریم بتیسی دوم) دیہاتی افسانوں میں ان کا بہترین افسانہ ہے، مگر اس میں بھی رشوت کا ذکر ہے۔ اس کی وجہ سے دیہاتیوں کی پریشانی نہایت تفصیل کے ساتھ بیان کی گئی ہے۔ داروغہ ذوالفقار علی خاں کا یہ کہنا کہ۔

"پولیس کے محکمہ میں جو رشوت نہیں لیتا اسے میں احمق سمجھتا ہوں۔ میں نے دو ایک سب انسپکٹر دیکھے ہیں، لیکن ہمیشہ تباہ، کبھی معتوب، کبھی معطل، کبھی برخاست"

محکمہ پولیس پر بڑی چوٹ ہے اور صداقت پر مبنی ہے۔ اور بھی کئی افسانے ہیں جن میں رشوت ستانی کے مصائب اور حاکموں کی چیرہ دستیوں کو چبھتے ہوئے پیرایہ میں بیان کیا ہے۔

دیہاتیوں کا کردار | ہم امیروں اور حاکموں کے کردار کا اندازہ تو کر چکے اب دیہاتیوں کے کردار بھی دیکھیں گے۔ (پریم چالیسی) میں ان کا ایک اچھا افسانہ (منتر) ہے اس کی ابتدا یوں ہوتی ہے۔

"شام کا وقت ہے۔ ڈاکٹر چڈھا گولف کھیلنے جا رہے تھے۔ موٹر دروازے کے سامنے کھڑی تھی، کہ دو کہار ڈولی لیے آتے ہوئے دکھائی دیے۔ ڈولی کے پیچھے ایک بوڑھا نحیف آدمی لاٹھی ٹیکتا ہوا چلا آتا تھا۔ ڈولی مطب کے سامنے آکر رک گئی۔ بوڑھے نے دھیرے دھیرے دروازے پر آکر اندر جھانکا۔ ایسی صاف ستھری زمین پر اسے پیر رکھتے ہوئے ڈر معلوم ہوتا تھا کہ کوئی چلا نہ دے۔

ڈاکٹر صاحب نے چق کے اندر سے گرج کر کہا "کون ہے کیا چاہتا ہے"۔

بوڑھے نے ہاتھ باندھ کر کہا "حضور غریب آدمی ہوں میرا لڑکا کئی دن سے ....

...... " ڈاکٹر نے سگار جلاتے ہوئے کہا "کل سویرے آؤ سویرے"۔

آخر ڈاکٹر صاحب چلے گئے اور بوڑھے کی منتیں صدا بصحرا ثابت ہوئیں۔ بوڑھے کا پیارا بچہ

اللہ کو پیارا ہوا۔ بوڑھا بھگت تھا۔ سانپوں کے ڈسے اس سے شفا پاتے تھے اور دور دور تک اس کی شہرت تھی۔ اتفاق کہیے کہ ڈاکٹر چڈھا کے عزیز بیٹے کا مشغلہ بھی سانپوں کو پکڑنا اور پالنا تھا۔ وہ پالتو سانپوں کو رام تو کر چکا تھا لیکن۔

عاقبت گرگ زادہ گرگ شود

کے بمصداق ایک کالے ناگ نے عین تقریب کے موقع پر اس کو ڈس لیا۔ یہ اطلاع رفتہ رفتہ بھگت تک پہنچ گئی۔ اس کے ضمیر اور نفس میں کشمکش پیدا ہو گئی اور اس نے نفس کا مطیع ہو کر۔

"کواڑ لگا دیے اور پھر آ کر بیٹھا۔ مگر اس کے دل کی حالت اس کتے کی سی ہو رہی تھی جو رات کو کسی اجنبی کی آہٹ پا کر مالک کے منع کرنے پر بھی بھونکنا نہیں چھوڑتا۔ زور سے چاہے نہ بھونکے مگر آہستہ آہستہ غراتا رہتا ہے۔ بھگت کا نفس اسے اپنی پوری طاقت کیساتھ روک رہا تھا، پر اس کے وجود کا ایک ایک ذرہ ہوا کے جھونکے سے اڑے ہوئے پتے کی طرح اس بدنصیب نوجوان کی طرف اڑا ہوا جا رہا تھا، جو اس وقت مر رہا تھا اور جس کے لیے ایک لمحہ کی دیر بازیافت کے امکان کو اور ٹال رہی تھی۔"

آخر بھگت نے اپنی ضمیر کی آواز کو جو نقار خانہ میں طوطی کی طرح تھی سن لیا اور آہستہ سے کواڑ کھولے کواڑ کی آواز سے بڑھیا جاگ پڑی اور ٹوکنے لگی کہ تم پھر وہیں چلے۔ بھگت نے کہا۔

"میں وہاں سانپ کا منتر پڑھنے تھوڑا ہی جا رہا ہوں۔ ذرا دیکھوں گا لوگ کیا کرتے ہیں۔ ذرا ڈاکٹر صاحب کا رونا پیٹنا دیکھوں گا۔ کس طرح سر پیٹتے ہیں، کس طرح پچھاڑیں کھاتے ہیں، ذرا دیکھوں گا، بڑے لوگ بھی ہمیں لوگوں کی طرح روتے ہیں یا صبر کر جاتے ہیں۔ وہ لوگ تو ودوان ہوتے ہیں، من میں سمجھ کر رہ جاتے ہوں گے۔"

بڑھیا کو اس انداز میں سمجھا کر اس نے بنگلے کی راہ لی اور افتاں و خیزاں وہاں پہنچکر ڈاکٹر چڈھا کی زندگی کے سہارے کو بچا لیا۔ بھگت اور اس کی بیوی کا تو ایقان یہ تھا کہ ان کا لال محض ڈاکٹر کی لاپروائی کی نذر ہو گیا ہے ورنہ وہ ابھی نہ مرتا۔ یہ اعتقاد رکھتے ہوئے وہ ڈاکٹر کے

دشمن تھے، لیکن عموماً دیہاتی کسی کی موت کے وقت دشمنی اور دوستی کو بھول کر اس کی موت مٹی میں شریک ہو جاتے ہیں اگر بچانے کا موقع ہو تو اس کی بھی امکانی کوشش کرتے ہیں۔ مرنے والے کی یاد میں جو آنسو بہائے جاتے ہیں ان سے سارے داغ دھل جاتے ہیں۔ یہ دیہاتیوں کی بہت اہم خصوصیت ہے اور اس کی وضاحت منشی جی نے بڑی خوبی سے کی ہے۔

روشنی (واردات) میں وہ ایک دیہاتی بیوہ کا ایک ایسا بلند کردار پیش کرتے ہیں کہ ہندوستانی عورت کی تفسیر اس سے بہتر شاید ہی ہو سکے۔ واقعہ یہ ہے کہ ایک راجکمار شکار کرتے ہوئے راستہ گم کر چکے ہیں اور ایک طوفان میں گھر گئے ہیں۔ اس اثناء میں ایک عورت اپنے گاؤں کو نہایت تیزی سے جاتی ہے، راستہ میں راجکمار سے ملتی ہے اور ان کی رہبر بن جاتی ہے اور راستہ چلتے ہوئے راجکمار کے استفسار پر یہ بیان دیتی ہے۔

"ابھی تو کل چھ مہینے ہوئے بابو جی۔ بھگوان کی مرضی میں آدمی کا کیا بس بھلے چنگے ہل لے کر لوٹے، ایک لوٹا پانی پیا۔ تے ہوئی، بس آنکھیں بند ہو گئیں ...... تب سے بابو جی گھاس چھیل کر پیٹ پالتی ہوں ......"

"اس وقت مجھ پر ایسی رقت طاری ہوئی کہ میں آبدیدہ ہو گیا اور جیب سے پانچ روپے نکال کر اس عورت کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا "میرے طرف سے یہ بچوں کی مٹھائی کھانے کے لیے لو۔ مجھے موقع ملا تو پھر کبھی آؤں گا۔"

وہ ایک قدم پیچھے ہٹ کر بولی۔ "نہیں بابو جی یہ رہنے دیجئے۔ میں غریب ہوں لیکن بھکارن نہیں ہوں۔"

"یہ بھیک نہیں ہے۔ بچوں کی مٹھائی کھانے کے لیے ہے۔"

"نہیں بابو جی۔"

"مجھے اپنا بھائی سمجھ کر لے لو۔"

"نہیں بابو جی جس کے بیاہ ہو اسکی عزت تو میرے ہی ہاتھ ہے۔ بھگوان تمہارا بھلا کریں۔"

اس فرض شناسی اور خودداری کی مثال ایسی غریب طبقہ کی معمولی عورت میں باید و شاید نظر آتی ہے مگر دیہات میں یہ چیز عام ہے اور شہر میں چراغ لے کر ڈھونڈھنے کی ضرورت ہوگی۔ ہماری شہری تہذیب اور دیہاتی تہذیب میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ دیہاتی انسانوں کے کردار میں فرشتہ پن زیادہ ہے اور شہری انسان اپنی اس تہذیب میں مرا جارہا ہے جو "اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کر رہی ہے" وہ باوجود تعلیم یافتہ ہونے اور مہذب کہلانے کے بھی ایسے الفاظ زبان سے نہیں نکال سکتا۔ منشی پریم چند نے اسی سلسلے میں لکھا ہے "اگر تعلیم فی الحاصل تہذیب نفس ہے اور محض اعلیٰ ڈگریاں نہیں تو یہ عورت تعلیم کے معراج پر پہنچی ہوئی ہے"

"بے غرض محسن" پریم چند کا بہت مشہور افسانہ ہے جس میں "مشعل ہدایت" کی طرح دیہات کے متعلق بہت کچھ تفصیلات بتلائی گئی ہیں۔ لیکن تخت سنگھ اور اس کی بیوی کا کردار نہایت بلند ریوتی رانی کے بیٹے نے تخت سنگھ پر بہت سے مظالم توڑے۔ اور اب تخت سنگھ بیمار ہے یہ اطلاع ریوتی رانی کو ملی اور وہ مدد کرنے کے لیے روپیوں کی پوٹلی لے آئی۔ "روپیوں کی جھنکار سن کر اٹھ بیٹھا۔" رانی ہم اس کے بھوکے نہیں ہے مرتے دم گنہگار نہ کرو۔" اسی کی بیوی جب اُپلے بیچ کر بیوگی کے دن گذارنے لگی، تو ریوتی رانی نے ایک دن اصل قیمت سے زائد پیسے دیدیے۔ اُس دن سے ٹھکرائن نے اس کے یہاں اُپلے لانا بندکردیا۔

یہ بلند کرداری پریم چند کے ہر دیہاتی ماحول سے متعلق افسانے میں ملے گی کوئی افسانہ ان بلندیوں سے خالی نظر نہیں آتا۔ "بانکا زمیندار" (پریم پچیسی دوم) بھی ہے تو اس کو بانکے دیہاتی مل جاتے ہیں اور زمیندار کا بانکپن بھلا دیتے ہیں۔ "مشعل ہدایت" میں دیہاتیوں کی اپنے زمینداروں کے ساتھ وفاداریاں اور ان کی سادگیاں عیاں ہیں۔ انھیں مختار عام کس طرح پریشان کرتا ہے۔ پولیس کے ہاتھوں میں وہ کیسے گرفتار ہوتے ہیں۔ یہ سب مناظر ایک ایک کرکے آنکھوں کے سامنے سے گذرتے ہیں اور دل ہلا دیتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ ہمیں لیڈروں کے عادات و خصائل بھی معلوم ہوتے ہیں اور ہم دیکھ لیتے ہیں کہ ان کے

قول اور فعل میں کس قدر تضاد ہے۔

پریم بتیسی اول میں ایک افسانہ (قربانی) ہے اس میں گردھاری کی تصویر جس انداز سے کھینچی گئی ہے اس کی تعریف نہیں کیجا سکتی۔ ایک کسان اپنے کھیتوں اور اپنے زرعی آلات ہی کو اپنی زندگی سمجھتا ہے۔ جب یہ چیزیں چھن جاتی ہیں تو زندگی اس کے لیے اجیرن ہو جاتی ہے اور وہ دنیا کی نظروں سے اوجھل تو ہو جاتا ہے لیکن اس کے کھیت میں ہل چلانے والوں کو نظر آتا رہتا ہے۔ پریم چند نے ان چیزوں پر بہت زیادہ وقت صرف کیا ہے۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کی نظر ان چیزوں پر بہت گہری تھی۔ اگر وہ کسان کے متعلق لکھتے ہیں تو قاری یہ محسوس کرتا ہے کہ لکھنے والا ممکن ہے کہ کسان ہو۔ اگر وہ زمیندار کا خاکہ کھینچتے ہیں تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ زمیندار رہی ہوں گے، جب ہی تو ان جزئیات سے بخوبی واقف ہیں یہی ایک ادیب کا کمال ہے کہ خود بھی اس میں جذب ہو جائے اور پڑھنے والے کو بھی جذب کر لے۔ پریم چند مدرس تھے لیکن انھوں نے کوئی محکمہ یا طبقہ ایسا نہیں چھوڑا جس کی جزئیات کو نہ بیان کیا ہو۔

<u>بچوں کی نفسیات</u> | جس طرح پریم چند نے شہریوں۔ دیہاتیوں۔ حاکم و محکوم اور بڑی عمر کے آدمیوں کی کردار نگاری میں کمال دکھایا ہے اسی طرح وہ بچوں کی نفسیات پر بھی گہری نظر رکھتے تھے۔ اس کا سبب غالباً یہ تھا کہ ان کی زندگی کا زیادہ حصہ بچوں ہی میں بسر ہوا یوں بھی ہر شخص ان کی نفسیات سے کچھ نہ کچھ ضرور واقف ہوتا ہے، مگر پریم چند نے جہاں دوسرے کرداروں کا تفصیلی خاکہ پیش کیا ہے، اسی طرح بچوں کی حرکتوں کو بھی ظاہر کیا ہے۔ ان کے اکثر افسانے ایسے ہیں، جن میں کردار پیدا ہو کر پروان چڑھ گئے ہیں۔ گلی ڈنڈا (واردات) چوری اور قزاقی (پریم چالیسی اول) اسی قبیل کے افسانے ہیں۔

<u>خود نوشت سوانح افسانوں میں</u> | انھوں نے اکثر مقامات پر اپنے افسانوں میں اپنی زندگی کے حالات بھی سمو دیے ہیں اور اس طرح ان کا ادب ان کی زندگی کا آئینہ بن گیا ہے۔ ان کے والد کا

تعلق سر رشتہ ٹپہ سے تھا۔ "قزاقی" میں انہوں نے اس تعلق کو نہایت وضاحت کے ساتھ بتلایا ہے۔ قزاقی ایک ہرکارے کا نام ہے، جو منشی ٹپہ کے بچے سے بڑی الفت اور اُنس سے پیش آتا ہے۔ اس احساس کے متعلق وہ یوں بیان دیتے ہیں۔ "میرا دل فرطِ مسرت سے زیادہ اچھلنے لگتا خوشی کی امنگ میں میں بھی دوڑ جاتا" اور ایک لمحہ میں قزاقی کا کندھا میرا سنگھاسن بن جاتا۔ وہ مقام میری تمناؤں کا بہشت تھا۔ بہشت والوں کو بھی شاید وہ متحرک سرور نہ ملتا ہو گا جو مجھے قزاقی کے چوڑے کندھوں پر ملتا تھا۔"

اس کے بعد قزاقی کی برطرفی اور اس پر بچہ کا گریہ و زاری کرنا، بیسہ جمع کرنے کی ہوس، اور اس کے احساس پر خوشی۔ بڑے ہونے کے بعد اس عادت کا تبدیل ہو جانا، یہ سب چیزیں بچوں کی نفسیاتی کیفیتوں اور پریم چند کی زندگی پر کافی روشنی ڈالتی ہیں۔

لال فیتہ (خواب خیال) ان الفاظ سے شروع ہوتا ہے۔

"ذہانت کسی طبقہ کی میراث اور کسی اصول وراثت کی مطیع نہیں۔ مسٹر ہری بلاس اس کی مجسم دلیل تھے۔" کیا معلوم تھا کہ منشی ٹپہ کا بیٹا بھی کسی معمولی خدمت پر رہنے کی بجائے ہندوستان میں چوٹی کا ادیب بن جائے گا۔ اس کے بعد اور بھی کئی ایسے واقعات اس افسانے میں موجود ہیں جو پریم چند کی زندگی پر روشنی ڈالتے ہیں مثلاً وہ ایک جگہ لکھتے ہیں۔

"مگر ہری بلاس کا شوق طلب اس گرمی اور سردی سے مستغنی تھا اس عزم قوی کے ساتھ جو اکثر نادار طلبہ کا مایۂ امتیاز ہے۔ وہ کالج میں داخل ہو گیا۔ اگرچہ وہ ایک رئیس کے لڑکے کو پڑھا کر تعلیمی مصارف نکال لیا کرتا تھا مگر وقتاً فوقتاً اسے ایک مشت روپیوں کی ضرورت ہوتی تھی۔" اگر یہاں ہم ہری بلاس کی جگہ پریم چند کا نام رکھ دیں تو یہ سارے واقعات صحیح ہو جاتے ہیں اور افسانہ حقیقت بن جاتا ہے۔

ڈیمانسٹریشن (نجات) میں وہ لکھتے ہیں۔ "ہر ایک کمپنی کا ایک ڈرامہ نویس بھی ہوتا ہے۔ بھلا وہ کب گوارا کریگا کہ اس کمپنی میں غیر شخص کا داخلہ ہو۔ وہ اس تصنیف میں طرح طرح کے

عیب نکالے گا، اور کمپنی کے مالک کو بھڑکا دیگا" یہ پریم چند کا ذاتی تجربہ معلوم ہوتا ہے۔ اس کے بعد اکثر جگہ انھوں نے اس کی طرف جستہ جستہ اشارے کیے ہیں۔ ادیب کی عزت (نجات) میں جب قمر کی بیوی نے اس کو اپنی صحت قایم رکھنے کے لیے سیر و تفریح کو ضروری قرار دیا تو اس نے جواب دیا۔

"میں تو مل کا مزدور ہوں تم نے کبھی مزدوروں کو بھی ہوا کھاتے دیکھا ہے۔ جنھیں کھانے کی کمی نہیں، انھیں ہوا کی ضرورت ہے۔ جنھیں روٹیوں کے لالے ہیں، وہ ہوا کیا کھائیں گے۔ پھر تندرستی اور لمبی عمر کی بھی انھیں کو ضرورت ہے، جن کو زندگی کے عیش و آرام میسر ہیں۔ میرے لیے تو زندگی محض بار ہے۔ اس بار کو اور اٹھائے رکھنے کی خواہش مجھ میں نہیں .... چراغ کا کام جلنا ہے۔ اس کی روشنی پھیلتی ہے یا اس کے سامنے کوئی دیوار ہے، اسے اس سے کوئی مطلب نہیں .... ادبی خدمت اور فربہی میں خدا واسطے کا بیر ہے۔ اگر کوئی ادیب موٹا تازہ ہے تو سمجھ لیجئے کہ اس میں سوز نہیں۔ لوچ نہیں۔ چراغ کا کام جلنا ہے چراغ وہی لبالب بھرا ہوگا جو جلا نہیں۔"

کیا تعجب ہے کہ یہ الفاظ انھوں نے شیورانی دیوی سے کہے ہوں اور اسی پر ایک افسانہ کھڑا کر دیا ہو۔ ان افسانوں کے علاوہ جیل (نجات) تو بہ۔ مایہ تفریح (خواب و خیال) اور استعفیٰ (پریم چالیسی اول) میں انھوں نے اپنی زندگی پر کافی روشنی ڈالی ہے۔

عورت کا مرتبہ اور آزادی عورت کے متعلق پریم چند کے خیالات بہت اعلیٰ و ارفع تھے۔ وہ عورت کی آزادی کو بہت پسند کرتے تھے۔ ہندوؤں کے رسم و رواج نے عورت کو جس بُری طرح کچل ڈالا ہے، اس سے وہ سخت متنفر تھے۔ ان کے تقریباً نصف سے زیادہ افسانے عورت کی ہستی کو بلند و برتر اور قابل تحریم و تکریم بتلاتے ہیں۔ اس کے اعتقادات، اس کا ایثار، اس کی محبت اور اس میں مصائب برداشت کرنے کی قابلیت، خودداری، شوہر پرستی، اور مذہب کی

پابندی کا خیال اس کے خمیر میں ہے، اور اس کی تکمیل کے لیے وہ اپنی جان کی کبھی پروا نہیں کرتی۔ جب وہ ایک سے محبت کرتی ہے تو ہمیشہ اسی کو چاہتی ہے، خواہ اس کا جسم کسی اور کے حوالے ہو جائے۔ اس کی روح اس سے بے تعلق نہیں ہو سکتی جس کو اس نے اپنا پتی تسلیم کر لیا ہے۔ ان تمام اوصاف کے مدنظر وہ قابل احترام ہستی بن گئی ہے۔ اسی لیے وہ ان تمام مراعات کی مستحق ہے، جس سے زمانے نے اس کو محروم کر رکھا ہے۔ پریم چند نے اپنے افسانے "وکسم" (دودھ کی قیمت) میں اس کو آزادی نہ دینے پر اعتراض کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"مرد کو اگر اطاعت کی آزادی ہے تو عورت کو آزادی کیوں نہیں۔ وہ سمجھتا ہے کہ شادی نے ایک عورت کو غلام بنا دیا ہے وہ اس کے ساتھ جتنا چاہے ظلم کرے کوئی اس سے باز پرس نہیں ..... وہ جانتا ہے کہ عورت پابندیوں میں جکڑی ہوئی ہے۔ اسے رو رو کر مر جانے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ اگر اسے خوف ہوتا کہ عورت بھی اس کی اینٹ کا جواب پتھر سے نہیں اینٹ سے بھی نہیں محض تھپیڑ سے دے سکتی ہے، تو اسے کبھی بدمزاجی کی جرأت نہ ہوتی۔"

بازیافت (بتیسی دوم) میں عورت کے متعلق لکھتے ہیں۔

"عورت محض بچے جننے، شوہر کی خدمت کرنے، اور ایکادشی کا برت رکھنے کے لیے نہیں ہے اس کی زندگی کا مقصد اس سے بہت اعلیٰ و ارفع ہے۔ وہ انسان کی تمام مجلسی اور ذہنی ترقیوں میں برابر کا حصہ لینے کی مستحق ہے۔ وہ انسانی آزادی کی مساوی حق دار ہے۔"

غرض اس طرح انھوں نے اپنے اس خیال کی تائید کی ہے، اور عورت کو نہ صرف اس طرح قابل احترام ہستی بتلایا ہے، بلکہ وہ یہ کہتے ہیں کہ عورت مرد کی زندگی کو چاہے تو بنا سکتی ہے اور چاہے تو بگاڑ سکتی ہے۔ لیکن ہندوستانی عورت کا زیادہ تر یہ مطمع نظر رہا ہے کہ اپنے شوہر کی زندگی کو بنائے اسی خیال کے تحت پریم چند نے لکھا ہے۔

"جب تک کسی گلے میں جوا نہیں پڑتا سبھی کو کلیلیں سوجھتی ہیں۔ جوا پڑا اور سارا نشہ ہرن ہوا"۔
یہی کلیلیں انسان کو قعر مذلت میں گراتی ہیں۔ اگر ایسے وقت کوئی عنان گیر ہو جائے اور
رہبری کرے تو بدی کی راہ چلنے والا نیکی کا راستہ اختیار کر لیتا ہے۔ اس میں عورت کا بہت بڑا
حصہ ہے۔

شادی کے متعلق پریم چند کا خیال | پریم چند شادی کے بارے میں اپنی رائے کا اس طرح اظہار
کرتے ہیں۔

"شادی ایک مقدس فرض ہے۔ ایک روحانی معاہدہ ہے جب ہم دنیادی ذمہ داریوں
میں قدم رکھتے ہیں۔ جب ہمارے پیروں میں علایق دنیا کی بیڑی پڑتی ہے۔ جب ہم
فرایض اور پابندیوں کے آگے اپنے سر جھکاتے ہیں۔ ایسی پاک رسم کا احترام کرنا
ہمارا فرض ہے"[1]

لیکن اس رائے کے ساتھ وہ سیول میریج کے مخالف ہیں پریم چالیسی اول کے پہلے افسانے
(دو سکھیاں) میں چندا نے اپنی سہیلی پدما کو نصیحت کی۔

"دیکھنا، کہیں سیول میریج نہ کر لینا۔ شادی ہندو احکامات کے بموجب ہی ہو۔
ہاں تمھیں اختیار رہے کہ جو سینکڑوں بیہودہ لغویات اور بیہودہ گیان ہیں۔
ان کو نکال ڈالو۔ ایک قابل اور تعلیم یافتہ سنسکرت داں پنڈت کو ضرور بلانا۔
اس لیے نہیں کہ وہ بات بات پر ٹکے نکلوائے، بلکہ اس لیے کہ وہ دیکھتا رہے
کہ سب کچھ شاستروں کے احکامات کے بموجب ہو رہا ہے یا نہیں"۔

پدما نے ان نصیحتوں کو نہ سنا، اور رونو سے سیول میریج کر لی۔ کچھ تلخیاں اور بدمزگیاں پیدا
ہوئیں لیکن دونوں نبھاتے گئے اس سلسلے میں پدما نے چندا کو لکھا ہے۔

---

[1] - غبن اول۔ [2] بازار حسن دوم صفحہ ۲۱۔

"دیکھیں ہم دونوں میں کس کی کشتی کنارے لگتی ہے۔ تم اپنی دیسی پانچ ہزار برس کی بوسیدہ و قدیم کشتی پر بیٹھی ہو، میں تیز رفتار موٹر بوٹ پر۔ موقع، کوشش اور سائنس تمام میرے ساتھ ہیں، لیکن، گر کوئی ناگہانی آفت آجائے تو میں اسی موٹر بوٹ پر ڈوبوں گی۔ سال میں لاکھوں آدمی ریل سے کٹ کر مر جاتے ہیں، مگر کوئی بیل، گاڑی پر سفر نہیں کرتا۔ ریل کی تعداد بڑھتی ہی جاتی ہے۔"

ہماری معاشرت نمود و نمائش سے بھری ہوئی ہے۔ ہم صورت دیکھتے ہیں، لیکن سیرت دیکھنے کا ہمیں موقع نہیں ملتا۔ ظاہری حالات ہمیں زیادہ فریفتہ کرتے ہیں، اور اندرونی حالات تک ہماری کوتاہ نظری پہنچنے کا موقع نہیں دیتی۔ چنانچہ انہیں چیزوں نے پدما کو دلنود گرویدہ بنا دیا اور دلنود کو پدما کا۔ اس ظاہری حالت اور محبت میں ناکامی پر تنقید کرتے ہوئے چندرا نے لکھا۔

"سوانگ، آوارہ مزاج عورتوں کے لیے ہے۔ گھریلو عورتیں تو محبت کا خزانہ اپنے دل میں پوشیدہ رکھتی ہیں۔ زیور، کپڑے، سننے بولنے میں مست رہنے والے لوگ نااہل ہوتے ہیں۔ اپنی نااہلیت کو چھپانے کے لیے یہ سوانگ بھرتے ہیں۔ کتے کو خاموش رکھنے کے لیے اس کے سامنے ہڈی کے ٹکڑے پھینکتے ہیں۔ بیچاری عورتیں اپنا سب کچھ دے کر کھلونے پاتی ہیں، اور انھیں میں مست رہتی ہیں۔ بالائے سطح بلبلے تیرتے ہیں۔ موتی سمندر کی تہہ میں رہتے ہیں۔"

اس طرح پریم چند نے عورت کو سمندر کی تہہ میں رہنے والے موتی سے تشبیہ دی ہے۔ وہ عورت کو اتنی طاقتور بتلاتے ہیں، کہ غیر معمولی حالات میں جہاں مرد کی بھی جرأت جواب دے جاتی ہے، وہاں عورت استقلال کے ساتھ قدم جمائے کھڑی رہتی ہے۔ خواب پریشان (بتیسی دیم) میں وہ اس طرح رقم طراز ہیں۔

کنور امرناتھ ـــــ وہاں آسائشوں کی چیزیں نایاب ہوں گی درندوں کا خوف ہوگا۔

منورما — لیکن تم بھی ان تکلیفوں کی عادی نہیں ہو۔

کنور — میں مرد ہوں انہیں بآسانی برداشت کر سکتا ہوں۔

منورما — میں موقع اور ضرورت پر آگ میں کود سکتی ہوں عورتوں کی نزاکت مرد کا تخیل ہے، انہیں نازک کہکر زبردستی نازک بنایا جاتا ہے۔ ان کا جسم کمزور ہوتا ہے، پر دل، ارادہ اور ہمت کا وہ باندہ ہے جس پر زمانہ کے حادثات کا مطلق اثر نہیں ہوتا۔"

راجپوتنیوں کی عظمت | اس ارادہ اور باندہ کی مثالیں ہم ان افسانوں میں دیکھتے ہیں جنمیں راجپوتوں کی معاشرت، ان کا تمدن، ان کی تہذیب، ان کی جرأتیں اور ان کے حوصلوں کو ظاہر کیا گیا ہے۔ راجپوت کی جنگی قابلیتیں تاریخ جاننے والوں سے مخفی نہیں۔ یہی ایک قوم ہے، جو منظم رہ کر جنگ میں حصہ لیتی تھی، اور اسی قوم کے سورماؤں نے باہر سے آنے والی فوجوں کا مقابلہ کیا، اور ہندوستان کو غیر کے ہاتھوں میں جانے سے بچانے کی تا دم مرگ کوشش کی۔ ان میں اکثر راجہ اور رانیاں رستم و اسفندیار اور افراسیاب و جمشید کی طرح راجپوتوں کی قومی کہانیوں میں داخل ہو گئے ہیں — راجہ ہردول اور رانی سارندھا نے اس سلسلے میں لازوال شہرت حاصل کر لی ہے۔ پریم چند نے ان کے جو واقعات بیان کیے ہیں ان کے مطالعے کے بعد ان کی عظمت و جبروت اور ان کے تقدس کا سکہ ہمارے دلوں پر بیٹھ جاتا ہے۔

"وکرمادت کا تیغہ" (پریم پچیسی اول) میں مہارانا رنجیت سنگھ کے دور کی ایک کہانی ہے۔ اس میں برندا ایک بیوہ عورت ہے اور اپنی دل بہلائی کے لیے گنگناتی ہوئی گھر کے کام کاج کرتی ہے۔ مہارانا کے فوجی سن پاتے ہیں — اور جبراً اس کو اپنے پڑاؤ پر لیجا کر اس کا گانا سنتے ہیں۔ وہ انتقام کی خاطر مہارانا کے دربار میں پہنچتی ہے اور اس کے سامنے اپنا قصہ بیان کرتی ہے۔

"میں بیوہ عورت ہوں میری عزت کے پاسبان آپ ہیں۔ پتی بیوگ کے ساڑھے تین سال میں نے تپسوتی بن کر کاٹے تھے۔ مگر آپ کے آدمیوں نے میری تپسیا خاک میں ملا دی۔

میں اس قابل نہیں کہ لوٹ کر اپنے گھر جا سکوں۔ اپنے بچہ کے لیے میری گود اب نہیں کھلتی۔ اپنے بوڑھے باپ کے سامنے میری گردن نہیں اٹھتی۔ میں اب اپنے گاؤں کی عورتوں سے آنکھیں چراتی ہوں۔ میری عزت لٹ گئی۔ عورت کی عزت کتنی قیمتی چیز ہے۔ اسے کون نہیں جانتا۔ ایک عورت کی عزت کے پیچھے لنکا کا شاندار راج مٹ گیا۔ ایک ہی عورت کی عزت کے لیے کورو ونس کا ناس ہو گیا۔ عورتوں کی عزت کے لیے ہمیشہ خون کی ندیاں بہی ہیں اور راج لٹ گئے ہیں۔ میری عزت آپ کے آدمیوں نے لی ہے۔ اس کا جواب وہ کون ہے انصاف کس کا خون چاہتا ہے۔ اس کا فیصلہ آپ کریں۔"

نرمدا کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ مہارانا رنجیت سنگھ ایک دہقان عورت کا یہ حوصلہ، یہ خیال اور یہ جوشِ تقریر دیکھ کر سناٹے میں آ گئے۔ کانچ کا ٹکڑا ٹوٹ کر تیز دھار والا چھرا ہو جاتا ہے، وہی کیفیت انسان کے ٹوٹے دل کی ہے۔"

غریب راجپوتنی کے یہ الفاظ مہارانا کو سکتے میں ڈال گئے اور اس کے دل پر بھی عورت کی عظمت کا سکہ بیٹھ گیا۔ اسی طرح رانی سارندھا کے الفاظ کی شان اور سطوت و شوکت ان لفظوں سے ظاہر ہوتی ہے۔

عالمگیر کے ایک امیر ولی بہادر خاں نے رانی سارندھا کے بیٹے کا گھوڑا چھین لیا اور رانی اس کو لینے کے لیے اپنی فوج کے ساتھ عالمگیر کے دربار میں پہنچی جہاں امیر موجود تھا۔ خان صاحب اور رانی میں سوال جواب ہوئے۔ خان صاحب نے دینے میں عذر کیا تو رانی نے کہہ دیا کہ اس کا فیصلہ تلواریں کریں گی۔ لیکن عالمگیر نے بیچ بچاؤ کر دیا اور رانی سے کہا کہ اس گھوڑے کو واپس کر دیا جائے گا لیکن اس کی قیمت بہت گراں ہو گی۔

رانی — میں اپنا سب کچھ قربان کرنے کو تیار ہوں۔

عالمگیر — جاگیر اور منصب بھی۔

رانی — جاگیر اور منصب کوئی چیز نہیں۔

عالمگیر ــــ اپنا راج بھی۔

رانی ــــ اس کی بھی میرے نزدیک کچھ ہستی نہیں۔

عالمگیر ــــ ایک گھوڑے کے مقابلہ میں۔

رانی ــــ جی نہیں۔ اس چیز کے مقابلے میں جو دنیا میں سب سے زیادہ پیاری ہے۔

عالمگیر ــــ وہ کیا ہے۔

رانی ــــ اپنی آن۔

اسی بندیل کھنڈ کی راجکماری نے جب اپنے بھائی انردھ سنگھ کو اپنے ساتھیوں کو کٹوا کر آتے دیکھا اور میدان کارزار کے واقعات بیان کرتے سنا تو اس کی تیوری پر بل پڑ گئے، اور غرور کی سرخی سے چہرہ سرخ ہو گیا۔ بولی۔ "بھیا۔ تم نے خاندان کی رسم کھو دی۔ کبھی ایسا نہیں ہوا" انردھ سنگھ لوٹ گیا' اور اس کی بیوی سیتلا دیوی ناگن کی طرح بل کھا کر اپنی ننند سے کہنے لگی "رسم اتنی پیاری ہے"

سارندھا ۔ ہاں

سیتلا ۔ اپنا پتی ہوتا تو کلیجہ میں چھپا کر رکھ لیتی۔

سارندھا ۔ نہ، کلیجے میں خنجر چبھو دیتی۔

چنانچہ اس نے وقت آنے پر اپنے ہاتھ سے اپنے پتی کے حکم کی تعمیل میں اس کو قتل کر دیا اور خود بھی اسی خنجر سے اپنے آپ کو دام زیست سے چھڑا لیا۔

اس سلسلے میں "بڑے گھر کی بیٹی" راجہ ہردول (پچیسی اول) راجپوت کی بیٹی ۔ دھوکا، جگنو کی چمک (بتیسی دوم) "رو ٹھی رانی" خاص طور پر قابل مطالعہ ہیں۔ ان میں راجپوتوں کے خصائل اور کارنامے نہایت تفصیل کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں بعض افسانے نیم تاریخی حیثیت رکھتے ہیں۔ راجپوتوں کی عظمت کا اظہار کرنیوالے افسانوں میں عورت کے کردار کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے اس لیے کہ یہی وہ مائیں تھیں جن کے سپوتوں نے ہارنے، پست حالی میں زندگی گذارنے اور غلام بننے رہنے میں اپنی توہین سمجھی اور ایک عرصہ دراز تک بیرونی حملہ آوروں سے مغلوب نہیں ہوئے۔

پانچواں باب ۔ پریم چند کا اسلوب بیان

طرز خط اور طرز بیان کی نقل | ہر شخص کا ایک خاص اور محبوب مصنف ہوتا ہے اسی کی کتابیں زیادہ تر اس کے مطالعہ میں رہتی ہیں اور وہ امکانی کوشش کرتا ہے کہ اپنی تحریریں بھی اسی نہج پر آجائیں۔ اس کوشش میں بعض حضرات صرف تحریری طرز ہی کی مشق نہیں کرتے بلکہ طرز خط بھی اڑانا چاہتے ہیں۔ چنانچہ اس کی بہت سی مثالیں ملیں گی۔ بنگال میں ٹیگور کے طرز خط کی نقل کی گئی حیدر آباد میں مولوی عبدالحق اور ڈاکٹر زور کے طرز خط کی بھی نقل کی اسی طرح کامیاب کوششیں ہوئیں لیکن طرز خط اور طرز تحریر دونوں میں بڑا فرق ہے۔ طرز خط کی نقل اڑانے میں کامیاب ہونا جتنا آسان ہے اسلوب بیان میں کامیابی حاصل کرنا اتنا ہی مشکل ہے۔ بعض لوگ امکانی کوشش کرتے ہیں کہ کسی خاص ادیب کے طرز تحریر اور طریق بیان کو استعمال کریں مثلاً مولوی عبدالحق نے حالی کے طرز میں لکھنے کی مشق کی اور ابتک لکھتے چلے آتے ہیں۔ لیکن بعض ناکام بھی ہوتے ہیں بعض اپنے بھی طرز طریق کو چھوڑ کر دوسروں کی روش اختیار کرتے ہیں اور ناکام ہو جاتے ہیں پھر ان کی کوئی راہ باقی نہیں رہتی۔ بعض خوش قسمت ادیب جنھیں دنیا میں اپنا نام روشن کرنا اور روشن رکھنا ہوتا ہے کسی ایک ادیب کے اسلوب کا اتباع کرتے ہوئے اپنے لیے ایک الگ راستہ قایم کر لیتے ہیں اور یہ راستہ اگر آسان ہو تو ایسا ہوتا ہے کہ آنے والی نسلیں اس پر چلنا اپنے لیے فخر سمجھتی ہیں اور اگر مشکل ہو تو ان کے انداز بیان پر واہ واہ تو ہوتی ہے لیکن تقلید نہیں ہوتی۔ ان میں آغا حیدر حسن، نیاز، حسن نظامی اور ملا رموزی بہت نمایاں ہیں۔

اپنے اسلوب کے متعلق پریم چند کا خیال | پریم چند کا تعلق شاہراہ بنانے والے ادیبوں سے ہے انھوں نے شرر، سرشار اور ٹیگور کی تصنیف سے اپنا مطالعہ شروع کیا، اور ابتدائی تحریروں میں ٹیگور کا رنگ

آ تا گیا لیکن ایک دو کتابوں کے بعد ہی ان مصنفین سے بہت آگے نکل گئے اور جہاں جس طرزِ ادا اور طرزِ تحریر کی ضرورت سمجھی انھوں نے اسی کو استعمال کیا۔ ان کی تحریریں سرشار کے رنگ میں ہیں اور کہیں شرر کے کہیں ٹیگور کے اور کہیں چیٹرجی کے اور یہ تغیرِ طرز اس امر کی شاہد ہے کہ وہ بذاتہٖ ایک صاحب طرز ادیب ہیں۔ وہ قاری کو جس ڈگر پر چلانا چاہتے ہیں، اس کی عنانِ ارادی کو اس طرف موڑ دیتے ہیں۔ قاری یہ سمجھتا ہے کہ وہ یہاں شرر کے رنگ میں ہیں اور یہاں ٹیگور کے رنگ میں انھوں نے موقع اور محل کے لحاظ سے کام کیا۔ خود ان کا بیان ہے کہ۔

"میرے طرز تحریر پر کسی دوسرے مصنف کے اسلوب بیان کا کوئی خاص اثر نہیں پڑا، لیکن پنڈت جسی نرائن اور ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور کا طرز کچھ کچھ اثر انداز ہوا ہے"[1]

ابتدائی دور میں سرشار کا اتباع ہر مصنف خواہ وہ بڑا ادیب ہو یا معمولی افسانہ نگار ابتدا میں ایک نمونہ اپنے پیش نظر رکھتا ہے، اور کوشش کرتا ہے کہ اسی کی طرز تحریر اختیار کرے، لیکن جوں جوں مشق بڑھتی جاتی ہے، اس میں ادبیت پیدا ہوتی ہے۔ وہ یا تو اپنے محبوب مصنف کا کامیاب مقلد بن جاتا ہے، یا اس کو پیچھے چھوڑ کر آگے نکل جاتا ہے۔ پریم چند بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں رہے۔ ہم جب ان کے سب سے پہلے کارنامے "ہم خرما و ہم ثواب" پر نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ شرر کا کوئی ناول ہمارے ہاتھ میں ہے۔ ان کی ہر فصل آن بان کی منظر نگاری کے ساتھ شروع ہوتی ہے اور پھر وہ مطلب پر آجاتے ہیں۔ دوسری کتاب "حب وطن کے قصے یا سوز وطن و سیر درویش" ہے۔ یہی وہ کتاب ہے جس نے نواب رائے کو پریم چند بنایا۔ اس میں افسانوں کی ابتدا نئے انداز سے ہوئی ہے۔ یہاں شرر کی منظر نگاری تو نہیں، لیکن زبان ویسی ہی فارسی آمیز ہے۔ ان دونوں کتابوں میں زبان کی وہ لطافتیں۔ روانی۔ سادگی۔ لوچ۔ شگفتگی اور حلاوت نہیں جو آگے چل ان کی تصنیفات کی روح بن گئی ہیں۔ ان بان میں

---

[1] ۔ پریم چند زمانہ نمبر صفحہ ۱۶۷۔

قدامت کا رنگ ہے، مثلاً سوزِ وطن کی پہلی کہانی "دنیا کا سب سے انمول رتن" اس طرح شروع ہوتی ہے۔

"دلفگار ایک پرخار درخت کے نیچے دامن چاک بیٹھا ہوا خون کے آنسو بہا رہا تھا۔ وہ حسن کی دیوی یعنی ملکہ دلفریب کا سچا اور جانباز عاشق تھا۔ ان عشاق میں نہیں، جو عطر پھلیل میں بس کر اور لباس فاخرہ سے سج کر عاشق کے بھیس میں معشوقیت کا دم بھرتے ہیں، بلکہ ان سیدھے سادھے بھولے بھالے فدائیوں میں جو کوہ و بیابان میں سر ٹکراتے اور نالہ و فریاد مچاتے پھرتے ہیں۔ دلفریب نے اس سے کہا تھا کہ اگر تو میرا سچا عاشق ہے تو جا، اور دنیا کی سب سے بیش بہا شے لے کر میرے دربار میں آ، تب میں تجھے اپنی غلامی میں قبول کروں گی۔"[۱]

یا اسی افسانہ کی آخری عبارت کا مطالعہ ان کی ابتدائی طرز تحریر کی عکاسی کرتا نظر آتا ہے۔

"یکایک پردہ زرنگار ہٹ گیا، اور دلفگار کے روبرو ایک دربار حسن آراستہ نظر آیا، جس کی ایک نازنین رشک زلیخا تھی۔ دلفریب بصد شان رعنائی مسند زرین کار پر جلوہ افروز تھی۔ دلفگار یہ طلسم حسن دیکھ کر متحیر ہو گیا، اور نقش دیوار کی طرح سکتے میں آ گیا، کہ دلفریب مسند سے اٹھی، اور کئی قدم آگے بڑھ کر اس کے ہم آغوش ہو گئی۔ رقاصان دلنواز نے شادیانے گانے شروع کیے، حاشیہ نشینان دربار نے دلفگار کو نذریں گذرانیں، اور ماہ و خورشید کو بعزت تمام مسند پر بٹھایا۔"

ہمارے ذہن میں پریم چند کے طرز نگارش کے جو نقوش مرتسم ہیں ان میں ان کی تحریروں کا نقش نظر نہیں آتا۔ اس کے لیے ایک علیحدہ جگہ نکالنی پڑتی ہے۔ ورنہ یوں ہمارے ذہن ان کو پریم چند کی تحریر سمجھنے سے ابا کرتے ہیں اس لیے کہ اس دور کی تحریریں پریم چند کی فارسی کی استادانہ قابلیت

---

[۱] سوزِ وطن۔

اور زبان پر اقتدار کاملانہ کی مظہر ہیں۔ فارسی کے مرکب الفاظ تشبیہیں اور استعارے ہمیں (فسانۂ عجائب) کی یاد دلاتے ہیں۔ حتیٰ کہ کرداروں کے نام بھی ایرانی ہیں۔ لیکن اسی کتاب میں ہمیں ایسے بھی اشارے ملتے ہیں، جہاں ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ان کا یہ اسلوب بیان قایم رہنے والا نہیں، اور نہ یہہ خیالات ہی قایم رہیں گے۔ وہ کسی نہ کسی طرف دھارا کو پھیر دیں گے۔ یہ کیفیت ان کے تیسرے افسانے "یہی میرا وطن ہے" میں بدرجہ اتم نظر آتی ہے۔ ساٹھ سال کے بعد ایک غریب الدیار اپنے وطن کو واپس آیا اور اپنے گھر کی طرف چل پڑا۔

"لیکن میرا گھر، میرا شکستہ جھونپڑا، جس کی گود میں برسوں تک کھیلا تھا، جہاں بچپن اور بے فکریوں کے مزے لوٹے تھے، جس کا نقشہ ابھی تک آنکھوں میں پھر رہا ہے، وہ اب ایک تودہ خاکستر ہو گیا تھا۔ مقام غیر آباد نہ تھا، صدہا آدمی چلتے پھرتے نظر آئے..... مگر...... ان کے چہروں سے تفکر اور پژمردگی نمایاں تھی، اور وہ سب افکار دنیا سے خستہ حال معلوم ہوتے تھے۔ میرے ساتھیوں کے سے قوی ہیکل، خوشرو، سرخ و سفید نوجوان کہیں دکھائی نہ دیے...... اکھاڑہ کی جگہ در و دیوار شکستہ اسکول تھا، اور اس میں چند مریض صورت گرسنہ رد اور دق پوش لڑکے بیٹھے اونگھ رہے تھے۔"

اس کے بعد وہ اپنے بچپن اور جوانی کے واقعات کا اعادہ کرتا ہے اور ہم بھی اس کے ساتھ محو ہو جاتے ہیں۔ وہ ساٹھ سال پہلے کے دیہاتی مناظر کا نقشہ پیش کرتے ہیں، اور ہمیں ایران سے ہندوستان میں اپنے دیکھے بھالے ملک اور اپنے وطن میں پہنچا دیتے ہیں۔ یہی ان کے خیالات کا تدریجی ارتقا ہے اگرچہ اسلوب نگارش میں نمایاں تبدیلی نہیں ہوئی، مگر ہم مستقبل کی جھلک یہیں دیکھ لیتے ہیں۔

دس سال بعد کا اسلوب بیان

فارسی الفاظ کی آمیزش ان کے ابتدائی افسانوں میں نظر آتی ہے اگر ہم ان کے کارناموں کو تاریخ وار تسلسل سے پڑھتے جائیں تو تین ہی چار افسانوں کے بعد یہ آمیزش غائب ہوتی نظر آتی ہے۔ "روٹھی رانی" اور "عشق دنیا اور حب وطن" کے بعد ۱۹۱۰ء میں "سیر درویش"

(زمانہ) میں شایع ہوئی اور یہ وہ زمانہ ہے کہ پریم چند نے اپنے ادبی زندگی کے دس سال پورے کر لیے ہیں۔ اس افسانے کے مطالعے سے اسلوب بیان کے فرق کا اندازہ ہوتا ہے۔

جب شیر سنگھ شیر سے انسان بن گئے اور مسافر نے وہاں پہنچ کر شیر سنگھ سے ودیادھری کے شبہ کی بنیاد پوچھی تو انہوں نے اثبات میں جواب دیا اور کہا۔

"اس کا تازیانہ بہت کارگر ہوا۔ باوجود اس کفارہ کے ندامت نے ابھی تک میرا دامن نہیں چھوڑا۔ دنیا کی کسی چیز کو قرار نہیں، مگر گناہ کا داغ لافانی ہے۔ نام نیک، مٹ جاتا ہے، مگر داغ گناہ نہیں مٹتا۔ میرے خیال میں ایشور بھی اس داغ کو نہیں مٹا سکتا۔ کوئی تلافی، کوئی کفارہ، کوئی تعزیر اس گناہ کے داغ کو نہیں دھو سکتی۔ شفاعت اور توبہ اور کنفشن یہ سب دنیا پرست زاہدوں کی ایجادیں ہیں۔ گناہ کی آگ روح کی عظمت اور آزادی کو جلا کر خاک کر دیتی ہے۔"

یا اسی افسانہ کا تقریباً آخری حصہ اس سے بھی سادہ اور دلاویز ہے اور اس رنگ پر آگیا ہے جو پریم چند نے آگے چل کر اختیار کر لیا۔

پریم بدا اجودھیا پہنچ کر پنڈت جی کو لے آئی اور ودیادھری سے ملایا ان دونوں کے ملنے کی کیفیت پریم چند نے ان الفاظ میں کھینچی ہے۔

"جوں ہی پنڈت جی اندر آئے، ودیادھری اٹھ کر ان کے پیروں سے چمٹ گئی۔ دیوی نے بہت دنوں کے بعد پتی کے درشن پائے ہیں۔ آنسوؤں سے ان کے پیر پکھا رہی ہے۔ جس طرح مینہ برسنے کے بعد گلاب کے پودے سے پانی کی بوندیں ٹپکتی ہیں، اسی طرح پنڈت جی کی آنکھوں سے آنسو کی بوندیں ٹپک رہی ہیں، دونوں کے دل مسرت سے امڈے ہوئے ہیں۔ انسان خوشی میں بھی روتا ہے، جس طرح کبھی کبھی دھوپ میں ترشح ہو جاتا ہے .... میں نے رخصت کی اجازت چاہی ...... ودیادھری نے میری طرف آنکھیں اٹھائیں پتلیوں کی جگہ دل رکھا ہوا تھا۔ دونوں ہاتھ آسمان

کی طرف اٹھا کر بولی ایشور تمھیں اس نیکی کا بدلہ دے۔"

یہی وہ اسلوب ہے جس کو پریم چند نے اختیار کیا اور اس میں ترقی کرتے گئے۔

اکیس سال بعد کا اسلوب | اس افسانے کے گیارہ سال بعد" لال فیتہ" شایع ہوا۔ اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی طرز تحریر میں کافی فرق ہو چکا تھا۔ وہ ایک مشاق ادیب بن چکے تھے اور زبان پر بھی انھیں پوری طور پر قابو حاصل ہو چکا تھا۔ اسی افسانے سے ہم یہاں اقتباس درج کرتے ہیں۔

"تیسرے دن بابو ہری بلاس اپنے موضع میں آگئے۔ مکان بے مرمت پڑا ہوا تھا۔ چاروں طرف گھاس جم گئی تھی گاؤں والوں نے دروازے پر کھاد اور کوڑے کرکٹ کے ڈھیر لگا دیے تھے۔ ادھر کئی سال سے بابو صاحب گھر نہ آئے تھے۔ گھر میں قدم رکھنے سے کراہیت سی ہوتی تھی ...... عورتیں رنجنی کے ساتھ گھر کی صفائی کرنے لگیں۔ کئی مردوں نے شیو بلاس کو جھاڑو اور ٹوکری سے نجات دلادی۔ یہ دونوں پسینے میں شل ہو رہے تھے، اور سوچ رہے تھے کہ موٹا کام دنیا میں چاہے کتنا ہی دلاویز کیوں نہ ہو، واقعات کی دنیا میں وہ اتنا پسندیدہ نہیں۔ رام بھروسہ پنڈت نے بابو ہری بلاس سے کہا "بھیا، تم نے اچھا کیا، استیپھا دیدیا، دیس پردیس مارے مارے پھرتے تھے اب سکھ سے گھر میں رہو گے۔ گھر مٹی میں ملا جاتا تھا، اب بس جائے گا شیخ عیدو نے کہا، چاکری چاہے چھوٹی ہو چاہے بڑی، چاکری ہی ہے۔ جب اللہ نے سب کچھ تمہارے گھر میں دیا ہے، تو کیوں کسی کی بندگی کرو۔

گوبر چوکیدار بولا۔ مدا بابو ہدا (عہدہ) بڑا تھا۔

بھو جو کرمی نے کہا۔ ہدا تو بڑا تھا، مدا کتنے گوپیوں کا گلا ریتنا پڑتا، سینکڑوں کو جیل بھیجا ہو گا، اس لڑائی میں پرجا کو مار مار کر سرکار کو کرج دلایا ہو گا۔ دورے پر جاتے ہوں گے، تو بیگار لینا پڑتی ہو گی، ان کے ہاتھوں کتنے کسانوں کا اخراج اور بے دخلی ہوئی

ہو گی۔ گھر میں رہیں گے، تو اس جھنجھٹ سے تو گلا چھوٹ جائے گا۔

گوبر چوکیدار۔ رواب کتنا تھا۔ حکومت کتنی تھی۔

بھوجو۔ رُواب بڑے سے نہیں ہوتا۔ رواب بھل منسی سے ہوتا ہے۔ پدیا اور دھرم سے ہوتا ہے۔ رام بھروسے پنڈت کون بڑے والے ہیں، لیکن کیوں سب لوگ کھاٹ سے اٹھ کر پا لاگن کرتے ہیں۔ تھانیدار آتے ہیں تو ان کی کھاتر ایک چلم تماکو دینا سب کو اکھرتا ہے۔ لیکن شاستری مہاراج جس کے گھر دس پانچ چیلوں سمیت آجاتے ہیں، وہ اپنے بھاگ کو سراہتا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آج جو حکم دیں تو لوگ آگ میں کود پڑیں۔"

یہ ہے پریم چند کا زور بیان اور ان کی تہ بینی۔ وہ دیہاتیوں کی دکھتی رگ پکڑ لیتے ہیں۔ ان کے طرز گفتار پر قادر ہیں، اور ان کے خیالات کو اپنے خیالات میں سمو لیا ہے اور انھیں کی زبان میں اتنی شیرینی حلاوت اور دلاویزی کے ساتھ ہمارے سامنے بیان کرتے ہیں۔ بیان کیا کرتے ہیں، گویا ان کا دل ہماری آنکھوں کے آگے رکھ دیتے ہیں۔ یہ کمال اور یہ مصوری کسی اور کے ہاں نہیں مل سکتی۔

یہ ایک بڑی تصویر ہے، اور انھوں نے جذبات کو ظاہر کرنے کے لیے ایک وسیع میدان پیدا کر لیا ہے۔ لیکن اگر ہم غائر مطالعہ کریں تو چھوٹی تصویریں بھی سینکڑوں نظر آئیں گی۔ مثلاً وہ "میدان عمل" میں پانی برسنے کے بعد دھوپ نکلنے کے منظر کو ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں۔

"آج کئی دن کے بعد تیسرے پہر سورج دیوتا نے زمین کی فریاد سنی، اور گویا مراقبے سے نکل کر اسے دعائیں دے رہے ہیں، اور زمین گود پھیلائے ان کی دعاؤں کو بٹور رہی ہے۔"

یہ ایک پہاڑی علاقے کی تصویر ہے۔

"شمالی کوہستانوں کے بیچ میں ایک چھوٹا سا ہرا بھرا گاؤں ہے سامنے گنگا کسی دوشیزہ کی طرح ہنستی کھیلتی، ناچتی گاتی، چلی جارہی ہے۔ گاؤں کے پیچھے ایک اونچا پہاڑ

کسی بوڑھے جوگی کی طرح جٹا بڑھائے متین خیال میں محو کھڑا ہے۔"

یہی گنگا مائی تاریکی میں کرشن چندر (بازارِ حسن) کو خودکشی کے وقت اس لباس میں نظر آتی ہے۔ "گنگا کسی مریض کی طرح کھرے کی چادر اوڑھے کراہ رہی تھی۔ آس پاس کی تاریکی اور گنگا میں صرف روانی کا فرق تھا۔ یہ رواں تاریکی تھی۔ چاروں طرف ایسی اداسی چھائی تھی، جو کسی کی وفات کے بعد گھر پر چھا جاتی ہے۔"

اس سے آگے ہم نے کئی ایسے جملے نقل کر دیے ہیں جن میں چشم بصیرت نئی نئی تصویریں دیکھے گی۔

ہندی الفاظ کی آمیزش | پریم چند نے اپنا ابتدائی دور سرشار اور شرر کی صحبت میں بسر کیا، اس لیے ان کی تحریریں فارسی آمیز ہیں۔ لیکن وہ سنہ ۱۹۱۲ میں "سرسوتی اور لکشمی" کے لیے ہندی میں کہانیاں لکھ کر مشہور ہونے لگے تو ہندی کے الفاظ بھی انھوں نے اردو میں ملانے شروع کیے۔ لیکن یہ آمیزش کھانے میں نمک کے مصداق تھی ان لفظوں کو دوسرے افسانہ نگاروں نے بھی کہیں کہیں استعمال کرنا شروع کیا۔ ان الفاظ کی مثالیں حسب ذیل ہیں

بِنتی کرنا، درشن دینا، تپسیا، بردان، دھن، بل، وِدیا، کُل، سیوا، سیوک، ودیاوان یا وِدوان، بلوان، اِچھا، جُگ جُگ جینا، من موٹا کرنا، تیاگ، بھگتی، اشیرباد، رسوئی وغیرہ۔

اس کے بعد بعض ایسے الفاظ کو بھی انھوں نے اردو ادب میں داخل کرنے کی کوشش کی، جو عوام کی فہم سے بالاتر تھے۔ انھیں ابھی تک دیگر افسانہ نگاروں نے بھی استعمال نہیں کیا، اور وہ قبول عام کی سند حاصل نہ کر سکے۔ مثلاً

اَشٹ بُھجی، اُتّم پدارتھ، اُپکار، دَھنیہ، بدھی، اُپاسنا، دھرم ویر، جس کا نا سنکلپ رَکھشا، نوران، سماچار، دکشنا، نیوچھپر، اپرادھ، اگرہ، آلھا، کلیان کرنا، کنٹ لالسا، گپھا، دوج، شرادھ، بھیستر وغیرہ۔

اول الذکر الفاظ کا استعمال پریم چند نے بہت کیا ہے اور ان میں سے بعض ایسے بھی ہیں

جن سے زبان کی شیرینی، سلاست، سادگی اور حسن میں کافی اضافہ ہوا ہے۔ لیکن موخر الذکر الفاظ جہاں انھوں نے استعمال کیے ہیں، وہ پڑھنے والے کے ذہن پر ضرب لگاتے ہیں، اور اس کو سلاست اور شیرینی زبان کا عادی رہ کر اچانک زجر و توبیخ بھی سہہ لینی پڑتی ہے اور وہ دو دھیلے کی دو باتیں بھی سہی کہکر خاموش ہو جاتا ہے۔

ٹیگوریت :۔ عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ پریم چند نے ابتداً ٹیگور کا تتبع کیا، جس کا خود انہیں بھی اعتراف ہے۔ ٹیگور کے طرز کو صاحب "تاریخ ادب اردو" نے خیالی یعنی ٹیگوری اردو کے نام سے موسوم کیا ہے اور یہی وہ طرز ہے جس کو ٹیگور نے گیتانجلی میں اختیار کیا تھا۔ اس میں شاعرانہ جذبات کو شاعرانہ نثر میں بیان کیا گیا ہے۔ اس کی دوسری خصوصیت اس کا مختصر مفید ہونا ہے۔ کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ معنے پیدا کیے جاتے ہیں، گویا اس پر دریا کو کوزہ میں بند کرنے کی مثل صادق آتی ہے۔ اس لحاظ سے پریم چند اردو ادب میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ ان کے مختصر جملے جن میں زیادہ سے زیادہ معنے پنہاں ہوتے ہیں، اور جن پر افسانے اور ناولوں کی بنیادیں رکھی جا سکتی ہیں، ان کے افسانے اور ناولوں میں کثرت سے ہیں۔ یہ جملے انھیں بنانے نہیں پڑے بلکہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک دریا برف کے ٹیلوں یا ٹکڑوں کو اپنے ساتھ لیے بہا چلا جا رہا ہے ان میں کثر جملے ایسے بھی ہیں جو مستقبل قریب میں ضرب المثل بن جائیں گے اور ان کی بھی وہی حالت ہوگی جو اب بعض ضرب الامثال کی ہے کہ ہم ان کے مصنفین کے متعلق کوئی معلومات نہیں رکھتے لیکن ان کے جملوں کو بلا تکلف استعمال کیے جاتے ہیں۔ ان کے چند جملے یہاں نقل کیے جاتے ہیں۔

ا ۔ کثیف برتن سے صاف پانی بھی گندہ ہو جاتا ہے نفرت سے بھرا ہوا دل پاک مذاق بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ (بیوہ)

۲ ۔ جلتے ہوئے دل سے دھوئیں کے سوا اور کیا نکل سکتا ہے (بیوہ)

۳ ۔ حسد کی آگ محسود کی ترقی اور بہتری کے ساتھ تیز اور مشتعل ہوتی جاتی ہے، اور

اسی وقت بجھتی ہے، جب محسود کی زندگی کا چراغ بجھ جاتا ہے۔ (جلوۂ ایثار)

۴۔ شاعر وہ شعبدہ باز ہے جس کی پٹاری میں بجائے سانپوں کے دل بند ہوتے ہیں۔ (جلوۂ ایثار)

۵۔ بوڑھے ہوتے ہوتے سو جاتے ہیں اور جو ہے کار ہیگنا سن کر جاگ اٹھتے ہیں (منتر)

۶۔ تیوہار، تماشہ دیکھنے، عمدہ عمدہ چیزیں کھانے اور بڑھیا بڑھیا پوشاکیں پہننے کا نام نہیں ہے۔ یہ برکت ہے، یہ تپسیا ہے، اپنے بھائیوں سے محبت و ہمدردی جتانا تیوہاروں کا خاص مقصد ہے۔ کپڑے سرخ کرنے سے پہلے خون کو سرخ بنالو۔ سفید خون پر یہ سرخی زیب نہیں دیتی۔ (آنسوؤں کی ہولی)

۷۔ ہندوستان میں سرسوتی کی پوجا لکشمی کی ناراضی کے مُرادف ہے۔ (ادیب کی عزت)

۸۔ جس طرح سوکھی لکڑی جل اٹھتی ہے، اسی طرح بھوک سے باولا انسان ذرا ذرا سی بات پر تنک جاتا ہے۔ (بڑے گھر کی بیٹی)

۹۔ عورت گالیاں سہتی ہے، مار سہتی ہے، مگر میکے کی نندا اس سے نہیں سہی جاتی۔ (بڑے گھر کی بیٹی)

۱۰۔ دلوں کا میل دھونے کے لیے آنسوؤں سے زیادہ کارگر کوئی چیز نہیں۔ (بڑے گھر کی بیٹی)

۱۱۔ جو پسینہ بہائیں، وہ روٹیوں کو ترسیں، اور جنھوں نے حرام کاری کو اپنا پیشہ بنا لیا ہے، وہ ہماری محفلوں کی زینت بنیں۔ میں یہ جور و ستم نہیں دیکھ سکتا۔ (راج ہٹ)

۱۲۔ مکار آدمی کو اپنے جذبات پر جو قدرت ہوتی ہے، وہ کسی درویش کامل کو بھی مشکل سے حاصل ہوتی ہے۔ اس کا دل روتا ہے، مگر ہونٹ ہنستے ہیں، دل مسرت کے مزے لیتا ہے، مگر آنکھیں روتی ہیں۔ دل حسد کی آگ سے جلتا ہے، مگر زبان سے قند و شکر کی ندیاں بہہ نکلتی ہیں۔ (آلھا)

۱۳۔ پجارن کا کام تو پوجا کرنا ہے۔ دیوتا اس کی پوجا قبول کرتا ہے یا نہیں یہ سوچنے کی

اسے فرصت کہاں ہے۔ (کسم)

۱۴۔ مردہ دلوں کے لیے دنیا ویران ہے (کسم)

۱۵۔ مردوں کے لیے بیوی پیر کی جوتی، اور عورت کے لئے مرد دیوتا ہے، بلکہ اس سے بھی بڑھکر۔ طلوع شعور کے ساتھ ہی وہ شوہر کے نام پر بک جاتی ہے۔ (کسم)

۱۶۔ ایشور تمام باتیں دے مگر جھوٹا غرور نہ دے۔ (دو سکھیاں)

۱۷۔ تنہائی رنج کو اور بھی جان گسل کر دیتی ہے۔ (مجبوری)

۱۸۔ تفریح جدت کی غلام ہے اور جدت کو تقویم پارینہ سے نفرت۔ (مجبوری)

۱۹۔ اعتقاد عورت کا وصف ہے۔ (مجبوری)

۲۰۔ جس گھر میں کوئی نہیں رہتا اس میں چمگاڈر بسیرا لیتے ہیں۔ (مجبوری)

۲۱۔ سیاسیات کے رموز حامل تنقید نہیں ہوتے۔ (لیلی)

۲۲۔ جب دل پر چوٹ لگتی ہے تو دلیلوں سے آدمی کی تشفی نہیں ہوتی۔ (مزار الفت)

۲۳۔ نفرت دلیلوں کی محکوم نہیں۔ (مزار الفت)

۲۴۔ گھر سے نکلی ہوئی عورت، تھان سے بھاگی ہوئی گھوڑی ہے، جس کا کچھ بھروسہ نہیں۔ (ابھاگنی)

۲۵۔ چوٹ کی گرمی میں درد کا احساس نہیں ہوتا۔ زخم ٹھنڈا ہو جاتا ہے تو ٹیسیں ہونے لگتی ہے۔ (گھاس والی)

۲۶۔ کسی کی تضحیک کرنا، اس کی نگاہ میں اپنا وقار کھونے کا نہایت آسان نسخہ ہے۔ (بازیافت)

۲۷۔ صورتِ افلاس، افلاس سے زیادہ تکلیف دہ ہے۔ (بازیافت)

۲۸۔ یہاں حرارت اس نقطہ پر ہے، جہاں آگ لگ جاتی ہے۔ (بازیافت)

۲۹۔ صبر کا باندھ جب ٹوٹ جاتا ہے، تو خواہش کا بہاؤ قابو سے باہر ہو جاتا ہے۔ (بوڑھی کاکی)

۳۰۔ صنفِ لطیف کے سامنے ہم فیاضی اور شرافت کے پتلے بن جاتے ہیں۔ (بنک کا دیوالہ)

۳۱۔ مایوسی محال کو ممکن بنا دیتی ہے۔ (بنک کا دیوالہ)

۳۲۔ ہمارے جذبات پیش بندیوں کے مطیع نہیں ہوتے (سوتیلی ماں)

۳۳۔ نفس کے سامنے ایک بار سر جھکانے کے بعد پھر سنبھلنا مشکل ہوتا ہے۔ گناہ کی انتھاہ ندی میں پھسل کر ہم دم بدم پیچھے ہی ہوتے جاتے ہیں۔ (ایمان کا فیصلہ)

۳۴۔ گناہ کے قابو میں آیا ہوا دل خزاں کا مارا ہوا پتہ ہے جو ہوا کے جھونکے سے گر پڑتا ہے۔ (ایمان کا فیصلہ)

۳۵۔ ندی کی لہریں چاروں طرف چلتی ہیں، لیکن دھارا اپنا راستہ نہیں چھوڑتی۔ (درگا کا مندر)

۳۶۔ مصیبت پڑنے پر انسان کچھ ضعیف الاعتقاد ہو جاتا ہے۔ دواؤں سے مایوس ہو کر ہم دیوتاؤں کے دامن میں پناہ لیتے ہیں۔ (درگا کا مندر)

۳۷۔ اجڑا ہوا گاؤں، کھویا ہوا اعتبار ہے۔ (بانکا زمیندار)

۳۸۔ غمناک خیالات تنہائی کے منتظر رہتے ہیں۔ (مرہم)

۳۹۔ کمزور ارادہ ہمیشہ سوال اور دلیل کی آڑ لیا کرتا ہے۔ (غیرت کی کٹار)

۴۰۔ مردوں کے دل پر حسن ظاہر کی ہمیشہ فتح ہوتی ہے وہ دل کی قدر کرنی جانتے ہی نہیں۔ (شکست کی فتح)

۴۱۔ خودی جب بیدار ہوتی ہے، تو دل کی کمزوریاں اس کے قریب آتے ڈرتی ہیں۔ (خودی)

۴۲۔ کوڑیوں سے روپیہ بنانا بیوپاریوں کا کام ہے۔ بابو لوگ تو روپیے کی کوڑیاں بناتے ہیں۔ (غبن صفحہ ۹۰)

۴۳۔ دل پر چوٹ لگتی ہے، تو آدمی کو کچھ نہیں سوجھتا۔ (غبن)

۴۴۔ محبت اپنے معراج پر پہنچ کر پرستش بن جاتی ہے۔ (ضبن صفحہ ۲۲۵)

۴۵۔ انسان کی زندگی میں ایسے مواقع بھی آتے ہیں جب اسے اپنی نیکیوں پر پچھتانا پڑتا ہے۔
(بازارِ حسن کی پہلی سطر)

۴۶۔ آج کل دھرم ریاکاروں کا اڈہ بنا ہوا ہے۔ (بازارِ حسن صفحہ ۲۸)

۴۷۔ فیشن وہ شاعرانہ خیال ہے، جو خون دل پی کر پلتا ہے، مگر حاصل بجز واہ ولکے اور کچھ بھی نہیں۔ (بازارِ حسن صفحہ ۹۴)

۴۸۔ حکام کی آنکھیں نہیں ہوتیں صرف کان ہی ہوتے ہیں۔ (بازارِ حسن صفحہ ۱۴۹)

۴۹۔ برسات کی آخری بوندوں کی طرح انسان کی آخری نصیحتیں بیکار نہیں جاتیں۔

ایسے سینکڑوں جملے ان کتابوں میں ملیں گے۔ کوئی افسانہ ایسے جملوں سے خالی نہیں اردو ادب کے بہت کم ادیب ہوں گے جن کے پاس ان جواہر ریزوں کی اس قدر فراوانی ہوگی۔

پریم چند کی تشبیہیں | پریم چند نے نئی نئی تشبیہیں اچھوتے استعارے اور نادر الفاظ بھی استعمال کیے ہیں اور اپنی طرف سے نئے الفاظ بھی بنائے ہیں ان کے ثبوت میں چند جملے یہاں پیش کیے جاتے ہیں۔

۱۔ بجلی کی روشنی سے سارا میدان برق قایم بنا ہوا تھا۔ (منتر)

۲۔ آج دس سال سے ضبط کر رہا ہوں۔ اپنے سینے کے اندر ایک کرہ نار چھپائے بیٹھا ہوں (خانہ برباد)

۳۔ جواہر نگار خول کے اندر جیسے تیز تلوار چھپی رہتی ہے اس طرح عورت کا نازک دل صبر اور استقلال کو اپنی گود میں چھپائے رہتا ہے۔ غصہ جیسے تلوار کو باہر کھینچ لیتا ہے، اسی طرح الفت عورت کے صبر اور استقلال کو بیدار کرتی ہے۔ (ماں)

۴۔ وہ شاعر کے تخیل کی طرح مسرت اور آرزو کی چیز تھی۔ (لیلی)

۵۔ اگن دیوتا اپنی آتشیں زبانوں سے دھرم ویر کا جس گا رہے ہیں۔ (جہاد)

۶۔ ساسیں اپنی تاخیر المراد ہوؤں کو لیے آجاتی ہیں۔ (خواب پریشان)

۷۔ جوتشی کی تقدیر خوانی، تقدیر سے بھی زیادہ مبہم، اور ان کے الفاظ مبالغے سے بھی زیادہ وسیع المفہوم۔ (خواب پریشان)

۸۔ اس کے رخصت ہوتے ہی ہوا کے مخمور جھونکے چلنے لگے۔ (راہ خدمت)

۹۔ معلوم نہیں کہ اس نے میرے کتنے دُرّے لگائے۔ یہاں تک کہ قمچی کو مجھ پر رحم آگیا۔ وہ پھٹ کر ٹوٹ گئی لکڑی کا کلیجہ پھٹ گیا، مگر انسان کا دل نہ پگھلا۔ (خون حرمت)

۱۰۔ چٹان سے ذرا دور ایک گھنا پاکھر کا درخت تھا، جس کی جڑیں خشک پتھروں سے چمٹ کر ان سے قوت نمو یوں حاصل کرتی تھیں، جس طرح کوئی مہاجن مفلس آسامیوں کو جکڑ کر ان سے سود کے روپیے وصول کرتا ہے۔ (مرہم)

۱۱۔ جب کشتی کروٹ لیتی، تو لوگوں کے دل اچھل اچھل کر لبوں تک آجاتے۔ (غبن صفحہ ۳۶۰)

۱۲۔ سب اس عورت پر مرمٹے جاتے تھے۔ کاش اور حیف سب کے چہرہ پر کھنچا ہوا تھا۔ (بازارحسن صفحہ ۵۰)

۱۳۔ اس کی ہمت برف کی طرح پگھلی جاتی تھی۔ (بازارحسن صفحہ ۸۳)

۱۴۔ جگر دھر تصویر لے کر اپنے کمرے میں گئے، اور اس کو آنکھوں سے پینے لگے۔ (پردۂ مجاز صفحہ ۱۷)

۱۵۔ شباب کی امید پیال کی آگ ہے جس کے جلنے اور بجھنے میں دیر نہیں لگتی یا کسی نادار کا تقار جو شام کو بنتا اور صبح کو بگڑ جاتا ہے۔ (بازارحسن صفحہ ۲۱۴)

پریم چند کی زبان: ان جملوں میں نہ صرف ندرت بیان۔ صناعی الفاظ اور شاعرانہ خیالات سموئے گئے ہیں بلکہ دلگداز اثر بھی شامل ہے۔ اگر یہ اثر ان چھوٹے چھوٹے جملوں میں نہ ہوتا، تو یہ سارے کے سارے جملے بھونڈے، بے جان اور جاپانی مال کی طرح نمایشی ہو کر ٹھٹھر جاتے، اور ان کے افسانے میں وہ خوبی، بلند معیاری اور دلاویزی پیدا نہ ہوتی، جو ان کا خاص وصف ہے۔

الفاظ کے ساتھ اصوات کی ہم آہنگی بھی ان کی دلکشی کا سبب ہے، اور یہ چیز ان کے زبان پر قابو رکھنے کی شاہد ہے۔ وہ غیر معمولی قلب و دماغ کے آدمی تھے۔ انھوں نے زبان کو بعض اور مشہور ادیبوں کی طرح مطیع ہو کر نہیں بلکہ قابض ہو کر استعمال کیا اور اپنی شخصیت کی خصوصیات کو نمودار کیا۔ ان کی زبان فطری اور سلیس ہے وہ جہاں اس میں درد بھرنا چاہتے ہیں بھر دیتے ہیں اور جہاں ظرافت کی ضرورت ہوتی ہے وہاں ظرافت۔ لیکن ظرافت سے زیادہ ان کی درد کی تصویریں کامیاب اور معیاری ہیں اس کا سبب یہ ہے کہ وہ بہت دور اندیش اور باریک بین تھے اور ان کی عمر کا وہ حصہ جو غور و فکر کا زمانہ ہوتا ہے، دیہات میں بسر ہوا۔ دیہات کی آبادی کسان اور مہاجن ہی پر مشتمل ہوتی ہے، اور کبھی کبھی ارباب اقتدار گاؤں کی چوپال میں آجاتے ہیں، تو ایک ہماہمی پیدا ہو جاتی ہے، اور دار و گیر کا ہنگامہ بلند ہوتا ہے۔ پریم چند دیکھتے ہیں، کہ اگر داروغہ آئیں تو کسان ہی ان کی بیگار سہتے ہیں۔ مہاجن کے تو وہ بندۂ بے دام ہیں، اور آباو اجداد کے رسم و رواج پر سختی سے کاربند، ان کو دیکھنے کے بعد دردمند دل روئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ پریم چند کا دل نہ صرف خود روتا ہے بلکہ ان کی قوت بیان اوروں کو بھی رلاتی ہے۔ حالانکہ ان کی زندگی ان کی اس خیالی زندگی سے بالکل برعکس تھی وہ زندگی کے معنے ہنس بول کر گذارنے کے لیتے تھے اور اپنی زندگی ایسی ہی بسر کرتے تھے بڑی سے بڑی مصیبت میں بھی چار کے سامنے مسکراتے، ہنستے، بلکہ قہقہے لگاتے تھے۔ ایسا قہقہہ جو انھیں لوگوں کو دیوانہ سمجھنے پر مجبور کردے۔ لیکن وہ جب قلم کے دھنی ہو کر بیٹھتے ہیں تو دل میں ٹیسیں پیدا کرتے ہیں، لیکن علامہ راشد الخیری کی طرح نہیں بلکہ رشید احمد صدیقی کے مزاح کے متضاد کہ وہ ہمارے لبوں تک تبسم کو کارفرما کرتے ہیں اور پریم چند ہمارے دل کو کپکپا دیتے ہیں۔ یا مقبول احمد پوری کے الفاظ ہیں۔

"راشد الخیری مرحوم دل کو پکڑتے ہیں تو بغیر دکھائے اور رلائے نہیں چھوڑتے۔ پریم چند کو جب کہیں ایسا موقع آجاتا ہے تو دل کی رگوں پر اس طرح انگلیاں رکھتے ہیں گویا

ان تمام چیزوں پر بحث کرنے کے بعد ایک آخری چیز رہ جاتی ہے وہ یہ کہ پریم چند نے حالات حاضرہ کے ادب کو تو متاثر کیا مگر خود کسی قسم کا اثر نہیں لیا۔ ہمارا جدید ادب اب جنسیات اور عریانیت کا پلندہ بنتا جا رہا ہے، لیکن پریم چند اس سے بہت دُور رہے۔ طالب الٰہ آبادی کا یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ

"پریم چند کی ایک خصوصیت مجھے اور نظر آتی ہے کہ ان کے کسی ناول میں رموز جنسی کے فلسفے کی چھاؤں ہے اور نہ کہیں عریانی۔ دراصل فحش اور سوقیانہ انداز تحریر سے اُن کا دامنِ قلم کبھی آلودہ نہیں ہوا"[۲]

یہ خصوصیت صرف ناولوں کے لیے ہی باعث امتیاز نہیں، بلکہ افسانے بھی اسی صف میں آ جاتے ہیں۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ پریم چند عصر حاضر کے نفسیاتی سیلاب میں نہیں بہہ گئے بلکہ نہایت اطمینان اور سکون کے ساتھ اس منجدھار میں کھڑے ہو کر دوسروں کو بچانے کی کوشش کرتے رہے۔ اس لحاظ سے ان کا سرمایہ ادب، اردو کے افسانوی ادب کی جان ہے۔

شاہد لطیف نے اپنے مضمون (ترقی پسند افسانوی ادب[۳]) میں لکھا ہے کہ

"اس نئے ادب سے بھوک اور نفسانیت کو نکال لیا جائے تو بہت کم باقی بچے گا۔"

پریم چند کے افسانوں میں بھوک کی کمی نہیں لیکن ان کے کرداروں کا معیار اخلاق اتنا بلند ہے کہ وہ اپنی بھوک کو ظاہر نہیں ہونے دیتے، اور اس طرح شاہد صاحب کے کلیہ سے مستثنیٰ قرار پاتے ہیں۔ ممکن ہے کہ صاحب مضمون نے پریم چند کو ترقی پسند ادیبوں میں شمار ہی نہ کیا ہو لیکن وہ ان کی کانفرنس کی صدارت کر چکے تھے اور انھیں خیالات کے حامی تھے، جو ترقی پسند ادیبوں میں پائی جاتی ہیں۔ البتہ آنکھیں اور زبان وہ نہ تھی جو آجکل کے بھوکے اور بقول کسے کیچڑ اچھالنے والے ادیبوں کی ہے۔

---

۲ پریم چند نمبر ۲۲۰، ص ۱۸۳ ۔ ۳ ۔ اردو اکتوبر ۱۹۴۱ء ۔

چھٹا باب افسانہ نگاری کے علاوہ پریم چند کی دیگر خدمات

پریم چند کی ناول نگاری | پریم چند نے جس طرح افسانوی دنیا میں اپنا ایک خاص مقام پیدا کرلیا وہ ناول نگاری میں بھی کسی سے پیچھے نہیں رہے۔ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ ہندوستانی تہذیب و تمدن اور معاشرت کے بیان کرنے میں موجودہ دور کے ناول نگاروں میں کسی نے زیادہ حصہ لیا ہے تو وہ پریم چند ہیں۔ ان کی ادبی زندگی ناول نگاری سے شروع ہوئی اور ناول نگاری ہی پر ختم ہوئی "ہم خرما و ہم ثواب" سے پہلے ان کا کوئی ناول اردو میں منظر عام پر نہیں آیا اور ہندی میں بھی اسی کے ترجمے (کشنا) سے ان کی ادبی زندگی کا آغاز ہوا۔ اس سے دو تین سال پہلے انھوں نے چند کہانیاں لکھیں اور وہ تعداد میں اتنی نہیں ہوئیں کہ ان کا کوئی مجموعہ شایع کیا جاسکتا۔ اس طرح ان کی ابتدا ہوئی۔ ان کی انتہا بھی اس طرح ہے کہ ان کا قلم (گئودان) لکھ کر ہمیشہ کے لیے رک گیا۔ (ہم خرما و ہم ثواب) سے لیکر (گئودان) تک اردو میں بارہ اور ہندی میں گیارہ ناول لکھے جن میں اکثر ایک دوسرے کے ترجمے ہیں یوں تو ہر ناول بجائے خود مکمل ہے لیکن (بازارحسن) اور (چوگان ہستی) لاجواب ہیں (چوگان ہستی) کو اردو دنیا شاہکار مانتی ہے اور پریم چند بازارحسن کو اپنا شاہکار سمجھتے ہیں۔ ہم یہاں ہر ناول کے متعلق سرسری طور پر اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں۔

ہم خرما و ہم ثواب ۱۹۰۴ء | اس کے متعلق ہم اوپر ذکر کرچکے ہیں کہ یہ ان کا سب سے پہلا ناول ہے اور اس کو انھوں نے بلحاظ مکالمہ و منظر نگاری شرر کے رنگ میں اور بلحاظ زبان سرشار کے انداز میں لکھا ہے۔ یہ ان کی پہلی کوشش ہے۔ اس لیے ہر لحاظ سے اس میں خامیاں ہیں۔ کہیں وہ ایک بڑے ادیب کی تقلید کرتے ہیں، کہیں دوسرے کی۔ کسی ایک کی طرز پر نہیں لکھتے

اس لیے اس ناول میں ان کی انفرادیت پیدا ہونے نہ پائی۔ اس ناول کی غائت اس دور کے عام ناولوں سے ہٹکر عشق و محبت کی اشاعت سے زیادہ قومی خدمت ہے۔ بیواؤں کی حالت زار کا خاکہ کھینچا ہے اور دولتمندوں اور خوشامد پسندوں کی فطرتوں کو نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے۔

ایک چیز جو خاص طور پر ان کے افسانوں اور ناولوں میں نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ پریم چند اپنے قاری کو نتیجے کے انتظار میں نہیں رکھتے۔ ناول کا پہلا باب۔ افسانہ کا پہلا فقرہ یا اس کے پہلے جملے یا کتاب یا افسانہ کے نام ہی سے وہ نتیجہ کا اظہار کر دیتے ہیں۔ لیکن یہ ذرا غور طلب ہوتا ہے۔ (ہم خرما و ہم ثواب) کا مطالعہ بتا دے گا کہ قومی خدمت اور عشق و محبت دونوں ساتھ ساتھ کارفرما ہیں۔ دونوں اپنے راستوں سے بھٹکتے نہیں بلکہ اپنی منزل کی طرف برابر گامزن ہیں اور کامیابی کے ساتھ جا پہنچتے ہیں۔ اب یہ (ہم خرما و ہم ثواب) سے زیادہ اچھا کیا نام تجویز کرتے۔

جلوۂ ایثار: یہ سنہ ۱۹۱۲ء میں شایع ہوا۔ یہ دوسرا ناول ہے اور ابھی وہ مشاق ناول نگار نہیں ہوئے لیکن پہلے ہی باب میں ان کا زور قلم ہمیں متحیر کر دیتا ہے، اور ہم اس کے مطالعے کے بعد اپنے آپ کو ایک مقدس اور پُر عظمت مقام پر محسوس کرنے لگتے ہیں۔ اس میں مکالمہ کی شان بہت بڑھی ہوئی ہے۔ سبا ما اور دیوی کی گفتگو کا ایک ایک لفظ ہم اسی انداز میں پڑھتے ہیں گویا مخاطبت ہمارے سامنے ہو رہی ہے۔ پھر پریم چند کی عظمت ہماری نگاہوں میں زیادہ ہو جاتی ہے جبکہ وہ سبا ما کی زبان میں دیوی سے سپوت بیٹا طلب کرتے ہیں اور سپوت کی تعریف یہ ہے "جو اپنے دیس کا اُپکار کرے"۔

نئی نئی تشبیہیں اور نئے نئے استعارے استعمال کیے ہیں۔ پامال اور فرسودہ ترکیبیں اور تشبیہیں بہت کم ہیں۔ ہر جگہ ان کی طبیعت کی جولانیاں زور دکھاتی ہیں۔ بعض جگہ جنسی امتیازات کو انہوں نے قایم نہیں رکھا اس لیے واقعاتی نقطۂ نظر سے ناول غیر فطری ہو گیا ہے، لیکن سرسری طور پر پڑھنے والے کی نظر اس پر نہیں پڑتی۔ وہ تو ایسا اد نٹ ہوتا ہے جس کی مہار

مصنف کے ہاتھ میں ہو۔ اس ناول میں اور اس کے علاوہ دو ایک اور ناولوں میں بھی پریم چند نے بعض ایسے واقعات لکھ دیے ہیں، جنھیں ہم مافوق الفطرت کہتے ہیں یا جن کا تعلق صرف عقاید سے ہے۔ ایسے واقعات اس میں شک نہیں کہ ہیرو کے اوصاف میں اضافہ کرتے ہیں اور اس کے کردار کو بلند کر دیتے ہیں لیکن ان کا اثر دیرپا نہیں ہوتا۔ ناول کے اختتام تک تو ان کی زبان کی شیرینی اور حلاوت ہمیں لاپروا نہیں ہونے دیتی، لیکن اس کے بعد ان واقعات پر تنقیدی نظر پڑنے لگتی ہے۔

فنی نقطہ نظر سے یہی نہیں بلکہ اکثر ناولوں میں پلاٹ غائب نظر آئیں گے۔ تدریجی ارتقاء بھی بعض ناولوں میں بسرعت ممکن ہو گیا ہے اور بعض جگہ بہت دیر میں، اس طرح ہماری ذہنی کشمکش تشنہ رہتی ہے اور ہم پوری طور پر لطف اندوز نہیں ہونے پاتے۔ (ہم خرما و ہم ثواب) کے مقابلے میں اس کی زبان غنیمت ہے لیکن پھر بھی دیگر ناولوں کے جیسی نہیں اور ہندی اور سنسکرت کے الفاظ تو (ہم خرما و ہم ثواب) سے زیادہ ہیں۔ شاید یہ بالاجی کے کارن ہوں۔ اس وجہ سے بھی بعض جگہ زبان ثقیل ہو گئی ہے۔

نرملا | ایک المیہ ناول ہے، جس میں ایک خاندان کی مصیبتیں بیان کی گئی ہیں۔ ایک ہی خاندان پر ان مسلسل مصائب کے پہاڑوں کا ٹوٹنا قیاس میں تو نہیں آتا، لیکن پریم چند کی زبان ہے اس لیے الفاظ دل میں اور واقعات آنکھوں میں اترتے چلے جاتے ہیں۔ سارے ناول کے مطالعے کے بعد بھی ان کے کرداروں سے ہمدردی نہیں پیدا ہوتی بلکہ وہ بھٹکتی پھرتی ہے۔ زبان میں دوسرے ناولوں کی طرح شوخی اور شیرینی الفاظ کا ترنم اور گھلاوٹ نہیں اور ڈرامائی انداز تحریر میں بعض جگہ پھیکا پن پیدا ہو گیا ہے۔ اس کا سبب اس کی طوالت ہے۔ پریم چند جزئیات کی تفصیل میں جانے کے لیے قاری کو پیچھے چھوڑ دیتے ہیں اور اس طرح عبارت میں روانی باقی نہیں رہتی۔

بیوہ | اس ناول کے متعلق ہم موضوع کے سلسلے میں ذکر کر چکے ہیں۔ ہمارے ہندوستانی گھروں میں

ایسے گھروں کی بہتات ہے، جہاں بیوائیں موجود ہیں۔ وہاں کے معمولی سے معمولی واقعات پر بھی پریم چند کی دوررس نظریں جا پڑتی ہیں۔ ان کا طرز بیان انھیں واقعات کو ایسا دلپذیر اور دلاویز بنا دیتا ہے، کہ فنی نقائص نکتہ چین کی نگاہوں سے پوشیدہ ہو جاتے ہیں۔ گھروں کی آپس کی کشیدگیاں، رسم و رواج کی پیچیدگیاں اور زندگی کے چند مسرت بخش لمحے سب ہی اس میں موجود ہیں۔ امرت رائے اور پورنا کا کردار جس خوبی سے بیان کیا گیا ہے، اس کی تعریف نہیں کی جاسکتی۔ وِدھوا آشرم کے انتظام کا خاکہ جس ماہرانہ انداز میں ڈالا گیا ہے، وہ قوم کے لیے مشعل راہ ہے۔ پریم چند کی زبان بھی اس ناول میں بہت سلیس ہوگئی ہے۔ اور فارسی کے الفاظ کی جگہ ہندی کے سبک اور گھل مل جانے والے الفاظ نے لی ہے۔

بازارحسن | یہ وہ ناول ہے جس کو پریم چند اپنا شاہکار سمجھتے تھے اور اگر چوگان ہستی ان کی تصانیف میں نہ ہوتی تو واقعی یہی شاہکار سمجھا جاتا۔ زبان اور دلچسپیوں کے لحاظ سے اس ناول کا معیار بہت بلند ہے۔ اور ناول کا موضوع، پریم چند کا وہی مطمح نظر، قوم کو سدھارنا اور نیکیوں کی طرف راغب کرنا ہے۔ وہ اس ناول میں اپنے کرداروں کو گناہوں کے سمندر میں ڈھکیل دیتے اور پھر کافی غوطے کھلانے کے بعد ان کی پاپ کی نیا کو نیکی کے دھارے پر لاڈالتے ہیں۔ اس سے ان کا مقصود دعوت عمل ہے۔ وہ یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں، کہ انسان لغزشوں کے بعد ہی سنبھلتا ہے، اور ٹھوکریں کھا کر ہی سیدھا راستہ چلتا ہے۔ ایک اور چیز یہ بھی نظر آتی ہے کہ وہ حُسن کو صرف لُٹانے کی دولت نہیں سمجھتے، بلکہ اس سے بڑے بڑے کام لیتے ہیں ان کے "زادراہ" کے ایک افسانے "وفا کی دیوی" میں ان کا یہ مقصد ابلا پڑتا ہے۔ ان کا ایقان ہے کہ انسان کے حُسن میں ذوق عمل کو اکسانے اور بیدار کرنے کی طاقت ہے۔ وہ جہاں چشم و ابرو کے اشاروں سے قتال عالم بن سکتا ہے، وہیں انسان سے ایسے مافوق الفطرت کام بھی کرواتا ہے، جو ہمارے وہم و گمان میں بھی نہیں آتے۔ ان کے کرداروں میں خدمت خلق کا عزم اتنا استوار ہوتا ہے کہ کسی کردار سے آخر تک لغزش ہونے نہیں پاتی۔

اور اس طرح وہ سماجی حالات کے درست کرنے کے لیے خاکہ بھی پیش کر دیتے ہیں۔

چوگان ہستی اہم اس کتاب کے متعلق اپنی رائے کا اظہار کرنے کی بجائے صرف دو آراء پر اکتفا کرتے ہیں اس لیے کہ چوگان ہستی ہی وہ کتاب ہے جس کو بیسویں صدی کے ربع اول کا بہترین ناول تسلیم کیا گیا ہے۔ مولانا عبدالماجد دریا بادی فرماتے ہیں۔

"سب سے بڑھ چڑھ کر ان کی ضخیم کتاب دو جلدوں میں ایک ہزار صفحہ کا ناول چوگان ہستی ہے، کہیں سے بھی کھول لیجئے یکساں دلچسپ۔ شروع کر دینا شرط ہے، ختم کیے بغیر جی ماننے کا نہیں۔ آورد اور تصنع کہنا چاہیئے کہ ان کا قلم جانتا ہی نہیں۔ جو صفحہ بھی الٹ کر دیکھئے سادگی، بے ساختگی اور آمد کے لحاظ سے خطۂ گلزار جس حصہ کا بھی انتخاب کیجئے دلکشی و دلاویزی اور جاذبیت کے اعتبار سے نمونہ بہار ہے"[۱]

طالب الہ آبادی اسی کے متعلق رقم طراز ہیں۔

"اگر پریم چند نے ساری عمر میں صرف یہی ایک ناول لکھا ہوتا تو بھی ان کو دنیا کے کامیاب افسانہ نویسوں کی صف میں عزت کی جگہ مل جاتی۔۔۔۔۔۔ چینی، جاپانی، مرہٹی، جرمنی اور ہندی سبھی زبانوں میں اس کے ترجمے یکساں مقبول ہیں۔ "لائف از اے اسٹیج" اور "ورلڈ از اے تھیٹر" ایسے کامیاب ناول بھی اس کے ساتھ تولے جائیں تو شاید ہلکے ٹھیریں۔

اردو ناول کا یہ پہلا قدم ہے، جہاں فطرت اور اخلاق نے رسمی شان و شکوہ کو ٹھکرا دیا ہے، اور جہاں "درد" اور "خدمت" کو اس کی اصلی جگہ ملی ہے۔

اس ناول میں نفسیاتی خوبیاں بھی ہیں اور زور بیان کا لطف بھی ہے اس کی ہر چیز اثر سے بھری ہوئی ہے طوالت ضرور ہے لیکن ایسی نہیں کہ ناظرین کا کہیں سے دل گھبرا جائے۔ لفظ

---

[۱] یادگار پریم چند صفحہ ۱۲۴ - ۱۸۹۰ -

یہی ہیں، جو ہم آپ ہر وقت بولتے ہیں پر جوہری کے ہاتھوں میں ان کا رنگ کچھ اور ہی ہے ...... وہ ایسے نگینے بن گئے ہیں، جن کے ہر زاویے سے نور کی جوت نکلتی ہے[۱]

پردۂ مجاز ساری کتاب عجیب و غریب واقعات سے بھری پڑی ہے۔ ہر جگہ حیرت ہوتی ہے کہ پریم چند فطرت نگار ہو کر مافوق الفطرت چیزیں کیسے لکھ گئے۔ مثال کے طور پر جگدیش پور کے راجہ کے تین جنم اور ہر جنم کی پوری یادداشت۔ تاریک گھاٹی میں محل کا وجود جہاں چار ہزار سال پہلے کے آلات بھی موجود ہیں۔ ہوائی جہاز بھی ہے "جو بادوباراں میں مستقل انداز سے اڑا جاتا ہے۔ گویا فطرت کی طاقتوں پر فتح کا نقارہ بجا رہا ہو"۔ بیوی کا دو مرتبہ اعادہ شباب اور رانی دیوپریا کا کیرکٹر حیرت میں ڈالنے کے لیے کافی ہیں۔

اس سے زیادہ حیرت انگیز چیز جو ہمیں نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ چکردھر یا تو دھنا سنگھ کے الفاظ میں دیا[۲] اور دھرم کا پتلا بنا ہوا تھا اور درو گہ کو بچانے کے لیے اپنی چھاتی پر سنگین روک لی تھی" یا پھر اپنے راج میں آکر دیہاتی کے ساتھ برا سلوک کیا۔ یہ واقعہ کچھ اس طرح اچانک پیش آتا ہے کہ ناول کا پڑھنے والا اس کے سننے کے لیے تیار نہیں رہتا۔ پریم چند ایک طرح سے یقیناً کامیاب ہیں کہ ان کا قاری ہمیشہ مستقبل کا منتظر رہتا ہے، اور پڑھتا چلا جاتا ہے، لیکن پردہ مجاز کو ختم کرنے کے بعد یہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ چند چیزیں ایسی بھی باقی رہ گئی ہیں جو محتاج اظہار ہیں اور انھیں کھلنے کا موقع نہیں ملا۔

بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ ناول مسئلہ تناسخ کی تشریح اور ویدانت فلسفہ کی توضیح کے لیے لکھا گیا ہے۔ اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ انسان کو مکتی حاصل کرنے کے لیے بے لوث محبت اور بے غرض خدمت کی ضرورت ہے ایسی محبت اور خدمت جس میں نفسانی اور شہوانی جذبات کا قطعاً وجود نہ ہو۔

کتاب دو حصوں پر منقسم ہے۔ پہلی اگرچہ تمہید ہے لیکن دلچسپ، مربوط اور نہایت

۲۔ ملاحظہ ہو سابقہ فٹ نوٹ

سلیس و صاف ہے۔ لیکن دوسری جلد غائت تصنیف کا اظہار، مسائل کی وضاحت، مسئلہ تناسخ کی پیچیدگیوں اور محیر العقول کارناموں سے معمور ہے۔ لیکن دلچسپی کا اس لیے فقدان نہیں کہ پریم چند ہمیں اپنے ساتھ ساتھ لیے پھرتے ہیں۔

غبن | موضوع کے سلسلہ میں ہم کہہ آئے ہیں کہ ہندوستانی عورت کا زیور کا شوق اور اس کی تکمیل کے لیے شوہروں کو دست غیب کی امداد اور پھر قرضہ کا بار یہ ساری چیزیں بنیاد افسانہ ہیں لیکن بات بڑھتی گئی اور افسانہ طول کھینچتا گیا جیسا کہ ندی پہاڑوں سے نکلتے وقت تو چھوٹی سی تھی لیکن سمندر سے ملنے تک اس میں ہزاروں ہی نالے اور ندیاں آکر مل گئیں۔ واقعات ایک حد تک فطری ہیں، مگر بعض جگہ کھٹکتے بھی ہیں۔ امیر اور غریب، مقیم اور مسافر کسبی اور شریف زادی، پولس اور مظلوم، سبھی کی کیفیتیں اس میں موجود ہیں۔ پولس ہتھکنڈوں کا بیان نہایت تفصیلی ہے۔ تبدیل مکانی کی وجہ سے ناول میں دلچسپی تو پیدا ہوگئی لیکن فنی نقطہ نظر سے نقص پیدا ہوگیا۔ جالپا کی شوہر پرستی انتہا کو پہنچی ہوئی ہے۔ اور ہندوستانی عورت سے ایسے واقعات کا سرزد ہو جانا تعجب خیز بھی نہیں۔ خود زہرہ اس کے کردار کا صحیح نقشہ ان الفاظ میں کھینچتی ہے "وہ اوپر سے موم ہے اور اندر سے پتھر۔ جو اتنی نازک ہوکر بھی اتنی مضبوط ہے۔"[1] آخر میں ایک چیز "بازار حسن" کی طرح یہاں بھی ملتی ہے پریم چند حسن سے ذوق عمل کو بیدار کرتے ہیں اور اُما اپنا بیان دیتے ہوئے اجلاس پر کہتا ہے" جالپا کی بے نفسی۔ حق پسندی اور استقلال نے میری آنکھیں کھولیں اور اس سے بھی زیادہ زہرہ کی دلجوئی اور خلوص نے۔ میں اسے اپنی خوش نصیبی سمجھتا ہوں کہ مجھے اس طرف سے روشنی ملی جدھر اوروں کو تاریکی ملتی ہے"

گوشہ عافیت | زبان۔ مکالمہ۔ سیرت نگاری اور واقعاتی لحاظ سے یہ ایک مکمل ناول ہے سماج کی پابندیاں۔ رسم و رواج کے قوانین۔ رشوت ستانی مادیت اور روحانیت مغربیت اور مشرقیت ان تمام چیزوں کو خوبی کے ساتھ سمویا ہے اور ان سے جو نقصانات قوم کو

---

[1] غبن صفحہ ۳۱۳۔

اٹھانے پڑ رہے ہیں، انھیں بھی وضاحت سے بیان کیا گیا ہے۔ نفسیاتی باریکیاں بھی نہایت فن کارانہ ہیں اس کے دوسرے حصہ کا معیار اتنا بلند نہیں جتنا کہ پہلے کا، بلکہ دوسرا اتنا پست نظر آتا ہے۔ بعض واقعات بھی حقیقت سے بُعد رکھتے ہیں۔

میدان عمل | اور ناولوں کی طرح اس میں بھی سماج کے نقائص کو منظر عام پر لایا گیا ہے، اور انکے دور کرنے کے علاج بتلائے گئے ہیں۔ جس طرح ابتدائی دور یعنے "ہم خرما و ہم ثواب" اور "بیوہ" وغیرہ میں عقد بیوگان اور ودھوا آشرم کے قیام پر زور دیا گیا ہے اس میں اچھوت تحریک دیہات سدھار، تخفیف لگان تنظیم مزدور پارٹی وغیرہ کا ذکر ہے۔ اس طرح ایک لحاظ سے یہ ناول ہمارے گذشتہ دس پندرہ سال کے سیاسی رجحانات کی تاریخ کہا جا سکتا ہے۔ ان چیزوں کے ساتھ ساتھ وہ اپنے فن کار قلم سے کردار نگاری کا بھی کمال دکھاتے ہیں اور نفسیاتی باریکیاں بھی ہر جگہ جھلکی پڑتی ہیں۔ ہمارے رہنمایانِ قوم اپنے آپ کو کس طرح خدائے ملت سمجھتے ہیں، اور مہاجن کس طرح غریبوں کا خون چوستے ہیں، ان کی تصویریں نہایت ماہرانہ انداز میں کھینچی گئی ہیں۔ پلاٹ کی ترتیب اور خوبی۔ قصہ کا ارتباط اور تسلسل اس کا تدریجی ارتقاء سیرت نگاری اور وہ تمام نزاکتیں اور لطافتیں جو لزوم افسانہ ہیں اس میں موجود ہیں۔ زبان سب ناولوں سے زیادہ اچھی اور دلکش ہے۔ چونکہ یہ انسانی کارنامہ ہے اس لیے واقعاتی نکتہ نظر سے اس میں معمولی نقائص ہیں جو درخور اعتنا نہیں۔

گئودان | نام کچھ عجیب سا ہے۔ اردو خواں طبقہ کی سمجھ میں نہیں آتا کہ کتاب میں کیا ہوگا اصل کتاب ہندی میں ہے اور اس کا بھی یہی نام ہے لیکن جس طرح پریم چند نے پریم آشرم اور کرم بھومی وغیرہ کے نام بدلے، اگر اس کا بھی موزوں نام دیا جاتا تو مناسب ہوتا۔

یہ ناول دیہاتی مناظر اور غریبانہ زندگی کا مرقع ہے۔ ہندوستان کی حقیقی تصویر ہماری نظروں کے سامنے آتی ہے۔ غریب کسان کی زندگی، اس کا چھوٹا سا جھونپڑا، اس کے جانور، اس کے کھیت اور اس کے فاقہ کش جسم میں سے اس کی ہڈیاں ابھری ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔

ہمارے سماج میں عورت کی کیا حقیقت ہے، اور اس کو مشرقی عورت کا کس طرح نمونہ بننا چاہیے
اس کی بھی مثالیں دی گئی ہیں۔ اس کے مطالعہ کے بعد ہم پریم چند کے پیشے کے متعلق سوچتے ہیں کہ
اگر وہ وکیل ہوتے تو کتنے کامیاب ہوتے۔ اس لیے نہیں کہ انھیں ساہوکارانہ گُر یاد ہیں، بلکہ
اس لیے کہ انھیں کسی چیز کے اثبات کے لیے دلائل اور براہین کی کمی نہیں ہوتی۔ ان کی قوت استدلال
کے جوہر جا بجا ابلے پڑتے ہیں۔ وہ نہایت آسانی سے بحث کرتے اور اپنی رائے کے استحکام
کے لیے ثبوت پیش کرتے چلے جاتے ہیں۔ افسانہ در افسانہ کے لیے پریم چند نے اس میں غریبوں کی
زندگی کے ساتھ امیروں کی زندگی کو بھی مدغم کر دیا ہے۔ یہ ان کی عادت سی ہے، کہ وہ اپنے
افسانوں میں دونوں قسم کے کرداروں کو ساتھ ساتھ لے چلتے ہیں۔ نقائص اس میں بھی ہیں۔ ان کے
کردار قصہ ہمیشہ اپنا رنگ بدلتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ کتاب چونکہ خاصی طویل ہے اس لیے اکثر جگہ
رکاوٹیں ہیں اور بندش میں چستی باقی نہیں رہی۔

اب تک ہم نے پریم چند کی ان خدمات کا ذکر کیا ہے جو صرف ادب سے تعلق رکھتے تھے
اور چونکہ ان کے ادب کا تعلق پوری طور پر ہماری زندگی ہمارے سماج اور ہمارے ملک سے ہے
اس لیے وہ ادبی لیڈر کہلانے کے مستحق ہیں۔ ان کے ادبی کارنامے اپنے دَور کے تمدن کی
تاریخ ہیں، جو مستقبل پر بھی کہیں کہیں روشنی ڈالتے ہیں۔ پریم چند ادیب کی حیثیت سے اپنے
فرائض سے عہدہ برآ ہوئے، اس کے علاوہ انھوں نے دیگر خدمات بھی انجام دی ہیں۔

پریم چند سوداگر | ابتدائی دور میں رسالہ (زمانہ) میں "رفتار زمانہ" لکھ کر پریم چند نے ہمارے
سیاسی شعور کو بیدار کیا اس سے ان کی سیاسی معلومات اور مدبرانہ قابلیت کا اندازہ ہوتا ہے۔
وہ کانگریس کی سرگرمیوں سے بھی متاثر ہوئے۔ ملازمت سے استعفا اسی اثر کا نتیجہ ہے۔
ملازمت سے استعفاء کے بعد انھوں نے ایک نئی زندگی شروع کی۔ انھیں اپنا اور اپنے
اہل و عیال کا پیٹ بھرنا تھا۔ اس لیے تجارت شروع کی لیکن ادیب صرف ادیب ہوتا ہے
کاغذ اور قلم کا دھنی، اس کو ان تجارتی بکھیڑوں سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ تاجر کی حیثیت بھی

بلا دغا وکی سی ہوتی ہے اور، شاعر یا ادیب کی بھی۔ یہ فقیر ہوتے ہیں لیکن دماغوں میں بادشاہت بسی ہوئی ہوتی ہے اور کیوں نہ ہو وہ ہمارے دلوں پر حکمرانی کرتے ہیں اور ہمارے خیالات کی زد ان کے قبضہ و اقتدار میں ہوتی ہے۔ اس طرح ایک انسانی دماغ میں دو بادشاہ، ادیب اور تاجر نہیں سما سکتے۔ پریم چند کو بھی تجارت میں ناکامی ہوئی اور وہ دکان اپنی بڑھا گئے۔

مدیر پریم چند | تجارت کے بکھیڑوں سے نجات حاصل کر کے انھوں نے ایڈیٹری شروع کی۔ مرجاد، مادھوری، ہنس اور جاگرن سب ان کی ادارت میں نکلتے رہے اس میں تاجرانہ ذہنیت کو روبہ عمل لانا تھا اس لیے انتظامی قابلیت کے لحاظ سے تو وہ ناکام رہے لیکن ادیبانہ حیثیت سے ان رسالوں کا معیار بہت بلند کر دیا۔ اس سلسلے میں بھی انھیں سخت تلخ تجربات اٹھانے پڑے۔ انھوں نے اپنے افسانوں، ناولوں، خطوط اور مضامین میں جگہ ایڈیٹر اور ان کے فرائض وغیرہ کے متعلق لکھا ہے۔ ان کا خیال تھا کہ

"رسالے کے ایڈیٹر کو ذاتی رجحانات اور دوستانہ تعلقات سے بالاتر رہنا چاہیے"۔

اور اس قانون کے وہ پابند رہے۔ وہ ایڈیٹر کو قوم کا خادم اور بہی خواہ دیکھنا چاہتے تھے اور اخبار کو ملک و ملت کا ترجمان۔ گویا ایڈیٹر اخبار ایک لیڈر رہے جو در پردہ قوم کے دلوں میں گھر کرتا جاتا ہے اور قوم اس سے غائبانہ محبت کرنے لگتی ہے۔ لیکن یہ بات اسی وقت پیدا ہوتی ہے جب کہ ایڈیٹر کا معیار بلند اور مقصد پاک اور بے لوث ہو۔ یہ پریم چند کے خیالات ہیں اور انھوں نے ان پر چلنے کی ہمیشہ کوشش کی سب پرچوں سے انھوں نے بجائے فائدہ کے نقصان اٹھایا، مقروض ہو گئے، اور فلم کمپنی کی ملازمت کو جو طوق گلو سے کم نہ تھی اس نقصان کی پابجائی کے لیے قبول کیا۔

پریم چند فلمی دنیا میں | ان کا فلم کمپنی میں کام کرنا فلمی دنیا کے لیے تو فال نیک تھا لیکن خود ان کیلئے وبال جان ثابت ہوا۔ مالک فلم کمپنی اور ادا آموزوں کی نکتہ چینیوں نے ان کی تصویر دلہا کے خد و خال کو مسخ کر دیا۔ چنانچہ دو فلم بھی نہ بننے پائے تھے کہ پریم چند اس زندانی زندگی سے تنگ آکر بنارس چلے گئے۔ اگر وہ کچھ دن اور ٹھہر جاتے تو شاید ان کے ڈراموں میں اضافہ ہو جاتا۔

پریم چند ڈرامہ نگاری کی حیثیت سے | ڈرامہ نگاری کی حیثیت سے پریم چند کا ادب میں کوئی مقام نہیں۔ بلکہ بہت کم لوگ واقف ہیں کہ انھوں نے دو تین ڈرامے بھی لکھے ۔ اجنٹا سانیٹون کو دیئے ہوئے ڈراموں کے علاوہ ان کا ایک ڈرامہ جو کتابی صورت میں شایع ہو چکا ہے "کربلا" ہے اس ڈرامہ کی شان نزول خود پریم چند کی زبانی سنیے۔

"میں نے حضرت حسینؓ کا حال پڑھا۔ ان سے عقیدت ہوئی ان کے ذوق شہادت نے مفتون کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ڈرامہ تھا .... ڈرامے دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک قرأت کے لیے، ایک اسٹیج کے لیے۔ یہ ڈرامہ محض پڑھنے کے لیے لکھا گیا تھا۔ کھیلنے کے لیے نہیں" [۱]

زبان کے متعلق بھی پریم چند ہی کی تنقید سنئے۔

"میں نے کبھی ادیب ہونے کا دعویٰ نہیں کیا۔ مجھے لوگ زبردستی انشا پرداز اور سحر نگار اور الم غلم لکھدیا کرتے ہیں میں بات کو سیدھی زبان میں کہہ دیتا ہوں۔ رنگ آمیزی اور انشا پردازی سے میں قاصر ہوں" [۲]

یہ ایک خط کے اقتباسات ہیں جو پریم چند نے مدیر زمانہ کے نام ان کے چند سوالات کے جواب میں لکھا تھا۔ اس کے علاوہ "شب تار" بھی ہے۔ افسانہ کی کتابوں میں بھی ایک دو مختصر ڈرامے ہیں لیکن چنداں قابل ذکر نہیں۔

معلم پریم چند | پریم چند کی زندگی تعلیمات کے محکمے سے شروع ہوئی۔ وہ بچوں کو تعلیم دینے لگے۔ رفتہ رفتہ انھوں نے بچوں سے بڑوں کو اور مدرسہ کی ایک محدود جماعت سے نکل کر ہندوستانی قوم کو تعلیم دی۔ اب یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ان کے افسانوں اور ناولوں نے اپنے مقصد میں کہاں تک کامیابی حاصل کی۔ یہ ضرور ہے کہ اکثر قدیم رسم و رواج ٹوٹ رہے ہیں۔ قید و بند کی

[۱،۲] ۔ یادگار پریم چند صفحہ ۱۰۰ ۔

بیٹریاں لُٹ رہی ہیں۔ لیکن معلوم نہیں کہ یہ انھیں ناولوں اورافسانوں کا اثر ہے یا انگریزی تعلیم، فیشن اور راج کا یا ان دونوں کا۔ البتہ ہم یہ ضرور کہیں گے کہ پریم چند نے اپنے موضوع سے ہندوستانی معاشرہ کے جمود کو توڑا، اور اپنی تقلید کرنے والے لوگ پیدا کیے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اُن کے افسانوں نے بھی ہمارے سماج اور معاشرہ کے بندھنوں کو توڑنے میں ضرور ہاتھ بٹایا ہے۔ اور انسانی آزادی کو آگے بڑھانے کی کوشش کی ہے۔ اس طرح ہم پریم چند کی خدمات کو سامنے رکھتے ہوئے انھیں متعلم، معلم، ناول نگار، افسانہ نگار اور فن کار مصلح قوم سمجھنے میں تامل نہیں کرتے۔

ساتواں باب - پریم چند کا اثر اردو افسانہ نگاروں پر

پریم چند کا موضوع ہندوستانی عوام تھے - انیسویں صدی کے ختم تک ہمیں ایسا کوئی افسانہ نگار نظر نہیں آتا جس نے براہ راست ہماری زندگی، ہمارے تمدن اور ہمارے معاشرے کے تار و پود کو اپنے افسانوں میں بکھیر کر رکھدیا ہو۔ افسانہ کا تو وجود و عدم ہی مساوی تھا البتہ چند ایسے ناول نگار ضرور تھے جو ایک مخصوص طبقہ کی ترجمانی کر رہے تھے لیکن اُن کی یہ ترجمانی بھی عوام سے کوئی تعلق نہ رکھتی تھی۔ پریم چند ہی اس میدان میں پہلے شخص نظر آتے ہیں جنھوں نے ہندوستانی عوام کو اپنے افسانے کا موضوع بنایا۔

یہ دور انگریزی تعلیم کا تھا۔ لوگ انگریزی ادب پر عبور حاصل کرنے کے بعد اس کوشش میں تھے کہ انھیں چیزوں کو یا تو اپنی زبان میں منتقل کیا جائے یا ایسا ہی ادب پیدا کیا جائے۔ گورکی، ترجنیف، گوگول، چیخوف اور موپاسان کے پڑھنے والے تو تھے لیکن ایسا ادب پیدا کرنے کی کسی نے کوشش نہیں کی۔ البتہ کبھی کبھی ان کے ترجمے رسالوں میں نظر آنے لگے۔ پریم چند ہی وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے ادب برائے زندگی کی تفسیر اپنے افسانوں میں شدت کے ساتھ ظاہر کی۔ وہ ادب کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں

"ادب کی بہترین تعریف تنقید حیات ہے۔ چاہے وہ مقالوں کی شکل میں ہو یا افسانوں کی یا شعر کی اسے ہمارے حیات کا تبصرہ کرنا چاہیئے" [۱]

وہ کہتے ہیں کہ۔

"ہمارا مذاق بڑی تیزی سے تبدیل ہو رہا ہے۔ ادب محض دل بہلاؤ کی چیز نہیں ہے۔ دل بہلاؤ کے سوا اس کا کچھ اور بھی مقصد ہے۔ وہ اب محض عشق و عاشقی کے راگ نہیں الاپتا

---

[۱] - نیا ادب کیا ہے؟

"بلکہ حیات کے مسائل پر غور کرتا ہے۔ ان کا محاکمہ کرتا ہے اور ان کو حل کرتا ہے۔ وہ اب تحریک یا ابہام کے لیے حیرت انگیز واقعات تلاش نہیں کرتا یا قافیہ کے الفاظ کی طرف نہیں جاتا بلکہ اس کو ان مسائل سے دلچسپی ہے جن سے سوسائٹی یا سوسائٹی کے افراد متاثر نظر آتے ہیں۔"[1]

اب اس نظریہ کی روشنی میں اگر ہم پریم چند کے کارناموں پر تنقید کریں تو معلوم ہوگا کہ انھوں نے ادب کی جیسی تعریف کی، اس کے مطابق وہ لکھتے رہے اور سوسائٹی اور سماج کے وہ بدنما داغ جو کلنک کا ٹیکہ بنے ہوئے ہیں ان کو دور کرنے کی کوشش کی۔ اپنے افسانوں کا پس منظر دیہات سے لیا اور کسان اور ان سے بالراست یا بالواسطہ تعلق رکھنے والے ان کے افسانے کا موضوع بن گئے۔

چونکہ نئی چیز کو دیکھنا اور اس کو حاصل کرنا یا اس کی نقل اتارنا انسانی جبلت ہے اس لیے بعض جدید افسانہ نگاروں نے اپنے آپ کو تخیلی حیثیت سے پریم چند کا شاگرد سمجھا۔ وہ ان کے ادب سے متاثر ہوئے اور ہر شخص نے بقدر ظرف پریم چند سے اکتساب فیض کیا کسی نے ان کے افسانے کے موضوع کا انتخاب کیا۔ کسی نے ان کے تمثیلی انداز کا۔ کسی نے اسلوب بیان کو اڑانے کی کوشش کی، اور اکثر افسانہ نگاروں نے ان کی تقلید میں روس، فرانس، ترکی، امریکہ اور انگلستان کو چھوڑ کر ہندوستان کا جائزہ لینا شروع کیا۔ اور اپنے افسانوں میں مقامی رنگ کو خاص جگہ دی۔

پریم چند کے مقلدین | سدرشن، اعظم کریوی، علی عباس حسینی، ایم اسلم، عظیم بیگ چغتائی، کرشن چندر، اوپندر ناتھ اشک، راجندر سنگھ بیدی، اور احمد ندیم قاسمی، پریم چند سے زیادہ متاثر ہوئے۔ اس طرح اگر غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ موجودہ دور کے مشہور افسانہ نگاروں میں نصف سے

---

[1] نیا ادب کیا ہے؟

زیادہ کا تعلق پریم چند سے ہے۔ ان میں بعض افسانہ نگاروں نے پریم چند کے قومی جذبہ کی تقلید کی اور اکثروں نے دیہات کو موضوع سخن بنایا۔

عظیم بیگ چغتائی | سدرشن اور عظیم بیگ مرحوم نے قومی جذبہ کو اکسایا۔ سدرشن نے تاریخی قصوں کو نیم تاریخی افسانوں کی حیثیت دی اور عظیم بیگ نے راجپوتوں کے عادات و اطوار۔ طریق بود و ماند اور ان کی آن بان اپنے مخصوص مزاحیہ انداز میں بیان کر کے اردو ادب میں بیش بہا اضافہ کیا۔ اس سلسلے میں ان کا افسانہ "سوان کی روحیں" اور ناول "چمکی" قابل مطالعہ ہیں۔

سدرشن | سدرشن کی زبان پریم چند کی طرح بہت سلیس ہے وہ تشبیہیں اور استعارے بھی لطیف اور مقامی استعمال کرتے ہیں وہ اپنے قصہ کا مواد صرف دیہات سے نہیں لیتے بلکہ کبھی کبھی شہر کے گلی کوچوں یا کارخانوں میں آ جاتے ہیں۔ پریم چند کے کرداروں کی طرح سدرشن کے کردار بھی واقعیت سے قریب ہوتے ہیں اور بالکل ہم میں کے انسان معلوم ہوتے ہیں۔ سدرشن نے ہمارے جذبات کو بہت زیادہ اکسایا ہے اس لیے "مصور جذبات" بن گئے۔ راجپوتوں کی عظمت کا اظہار ان کے بھی افسانوں سے ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے "عورت کی محبت" اور "محبت کا انتقام" قابل مطالعہ ہیں۔ سدرشن نے افسانوں اور ڈراموں کی تقریباً پچیس سے زائد کتابیں شایع کیں اور اب تھکے تھکے معلوم ہوتے ہیں۔

اعظم کریوی | اعظم کریوی نے گذشتہ سال اپنے افسانوں کا مجموعہ (شیخ و برہمن) کے نام سے شایع کیا ہے۔ اس مجموعہ کو پیش نظر رکھ کر ہم انھیں پریم چند کا مقلد نہیں کہہ سکتے البتہ ان کی اور دو کتابیں "پریم کی چوڑیاں" اور "کنول" پریم چند کے انداز تحریر اور اسلوب بیان کی غمازی کرتی ہیں۔ وہ دیہات کے مناظر کا بڑی خوبی سے خاکہ کھینچتے ہیں۔ دیہاتیوں کی تہذیب و تمدن کو نہایت اچھے پیرایہ میں ظاہر کرتے ہیں۔ اور بالکل پریم چند کی طرح جزئیات کی تفصیلات میں کھو جاتے ہیں تھوڑا اپنے ساتھ قاری کو بھی لیے لیے پھرتے ہیں۔ لیکن ان کے خیالات میں تنوع نہیں دو چار کہانیاں پڑھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ ہم نے اس کہانی کو پڑھ لیا ہے اس کا سبب یہ ہے کہ وہ

غور و فکر کم کرتے ہیں اور ایک ہی حالت پر لکھتے چلے جاتے ہیں۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ کریوی پریم چند کی تقلید تو کرتے ہیں لیکن پریم چند کے افسانے جس جوش و اثر کو اپنے دامن میں لیے ہوتے ہیں اس کا کریوی کے ہاں فقدان ہے۔ پریم چند کی طرح وہ بھی ہندی کے الفاظ استعمال کرتے ہیں اس کا ایک بڑا سبب تو یہ ہے کہ وہ ہندی کے شاعر ہیں اور "ہندی شاعری" کی تصنیف کے دوران میں اس زبان کا اثر ان کی زبان اور ادب پر کافی پڑ گیا ہے۔

علی عباس حسینی | "رفیق تنہائی"۔ "آئی سی ایس"۔ "باسی پھول" اور "کچھ ہنسی نہیں ہے" کے مصنف دن بدن عروج پر ہیں۔ نقش اول سے نقش ثانی بہتر ہوتا جا رہا ہے۔ سیرت نگاری اور کردار نگاری کی خصوصیات میں پختگی آ رہی ہے اور ان کا بھی موضوع دیہات ہے۔ وہ حقیقت نگاری کی طرف زیادہ راغب ہیں۔ پریم چند بھی آخری دور میں حقیقت نگار ہو چلے تھے۔ کرداروں کی بھی یہی کیفیت ہے۔ وہ ہم میں سے ہیں اور کہیں باہر سے نہیں لیے گئے، اس لیے ہمیں زیادہ اپیل کرتے ہیں۔ ان کی زبان پریم چند کی زبان کی طرح شیریں اور سبک ہے۔ اور انھیں الفاظ پر پورا قابو حاصل ہے۔ ابتداءً اکثر انھوں نے یہ کوشش کی ہے کہ پریم چند کی طرح اپنے افسانوں کا اختتام بھی پُرشکوہ جملہ پر کریں ۔اب وہ شکوہ باقی نہیں رہا بلکہ سیدھے سادے طور پر چبھتے ہوئے اور دردمندانہ انداز میں افسانہ ختم ہوتا ہے۔ اب ان کے افسانوں میں ماہر نفسیات کی باریک بینیاں داخل ہو رہی ہیں اور صنعتی پہلو کا اثر بھی نمایاں ہوتا جا رہا ہے۔ اور ان چیزوں کی وجہ سے جاذبیت میں اضافہ ہو رہا ہے۔

ایم اسلم | ایم اسلم کے بعض افسانے خاص طور پر مجموعہ "کارزار حیات" اور "تعبیر حیات" دیہاتی مناظر، دیہاتیوں کا کردار اور ان کے مصائب اور مشکلات اور ان کے باوجود بلند اخلاقی اور مہمان نوازی وغیرہ کا اظہار کرتے ہیں۔ ایم اسلم نے کہنے کو تو بہت کچھ لکھا، لیکن اگر اچھے افسانے جمع کیے جائیں تو مشکل سے ایک دو کتابیں تیار ہو سکتی ہیں۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایم اسلم لکھے جانا چاہتے ہیں، خواہ کچھ ہو، اور کسی معیار کا ہو۔ ان کے معیاری افسانوں

غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ دیہات کی تلخ حقیقتوں کو انھوں نے ایک نئی شکل میں ہمارے سامنے پیش کیا ہے۔ اس لیے کہ ایم اسلم زمیندار ہیں اور ان کی تحریر کے انداز میں بھی زمینداری کی بو آتی ہے۔ وہ رہتے شہر میں ہیں لیکن دورے کے واقعات لکھتے ہیں اور اس سلسلے میں ایک ایک دو دو چیزوں کا اظہار کر جاتے ہیں جس سے افسانے میں چمک پیدا ہو جاتی ہے۔ ان کا انداز تحریر زیادہ تر ڈرامائی ہے ان کے اشخاص قصہ ہی اکثر واقعات بیان کرتے ہیں اور ان کے کرداروں پر روشنی پڑتی ہے۔

کرشن چندر: کرشن چندر نے بھی حقیقت پسندی پر زور دیا ہے۔ "ہوائی قلعے" اور "طلسم خیال" سے زیادہ "نظارے" اس کے شاہد ہیں اپنا مطمح نظر واضح کرنے کے لیے انھوں نے ترقی پسند ادیبوں کے افسانوں کو "نئے زاویے" کی شکل میں پیش کیا ہے۔ حال ہی میں ان کا ایک اچھا ناول "شکست" شایع ہوا ہے اس میں ایک خاص بات یہ ہے کہ وہ ہمیں اپنے ساتھ بھٹکاتے ہوئے پیچیدگیوں میں رکھ کر سیدھا راستہ بھی بتلاتے ہیں۔ انھیں کاروباری زندگی پسند نہیں جس میں من و تو کے جھگڑے کے سوا اور کوئی چیز نظر نہیں آتی۔ پریم چند کا بھی یہی حال ہے۔ وہ شخصی فائدہ سے زیادہ قومی فائدہ کو پیش نظر رکھتے ہیں۔ ان کا ہیرو کبھی ذاتیات سے بحث نہیں کرتا۔ وہ حقیقت نگار زیادہ ہیں اور رومان نگار کم۔ لیکن کرشن نے ایک قدم آگے بڑھا کر ان دونوں چیزوں کو اپنی تحریروں میں مدغم کر دیا ہے۔ موجودہ سماج سے باغی ہیں۔ پریم چند کی طرح کہیں کہیں مزاحیہ رنگ بھی جھلکتا ہے وہ انسانی نفسیات کا بڑی گہری نظر سے مطالعہ کرتے ہیں۔ اس خصوصیت میں وہ پریم چند کے دوش بدوش چل رہے ہیں۔ ان کے افسانے "زندگی کے موڑ پر" اور "دو فرلانگ لمبی سڑک" ہر لحاظ سے کامیاب ہیں اول الذکر بقول صلاح الدین احمد کے "انسانی روح کی پکار کا ایک حیرت انگیز رکارڈ ہے جس میں آرٹسٹ نے سوز و غم کے نغمے قہقہوں اور مسکراہٹوں میں چھپا چھپا کر بھرے ہیں"[1]

---

[1] سالنامہ ادبی دنیا سنہ صفحہ ۳۵ (اسی میں پہلا افسانہ بھی شایع ہوا ہے)

اوپندرناتھ اشک | اشک اسی اسکول سے تعلق رکھتے ہیں ۔ انھوں نے بھی فطرت انسانی کا دقیق نظر سے مطالعہ کیا ہے، اور کرشن چندر سے زیادہ پریم چند سے متاثر معلوم ہوتے ہیں ۔ انہوں نے سماج کی ایسی تصویروں کو بے نقاب کیا ہے جو ہر کس و ناکس کو نظر نہیں آتیں ۔ ان کے افسانوں کے مجموعے "کونپل" "ڈاچی" اور "ستاروں کے کھیل" شایع ہو چکے ہیں ۔ انھوں نے اپنی فن کاری کی بدولت بہت کم مدت میں محفل ادب میں اپنے لیے جگہ پیدا کرلی ہے ۔

راجندر سنگھ بیدی | بیدی بھی سماج کے بھیدی ہیں اور اسی لیے وہ باغی ہیں "دانہ و دام" اور "گرہن" کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ زندگی کے تجربات کو نئی اور موثر شکل میں پیش کرتے ہیں ان کے افسانے پنجاب کی زندگی کا عکس ہیں اس لیے وہ محدود ہو کر رہ گئے ہیں ۔ زبان اتنی رواں، سلیس اور اچھی لکھتے ہیں کہ ان میں تصنع اور آورد کا دخل نظر نہیں آتا ۔

احمد ندیم قاسمی | ندیم بھی نو واردوں میں ہیں "چوپال" "بگولے" اور "گرداب" کا مطالعہ ظاہر کرتا ہے کہ جو کچھ وہ لکھتے ہیں اس کا تعلق دیہاتی زندگی اور کسانوں کی دنیا کے مختلف پہلوؤں سے ہوتا ہے ۔ اس پر ان کی نظر کافی گہری ہے ۔ اگر یہی رفتار رہے تو پریم چند کے بعد دیہاتی زندگی کے مصور یہی ہوں گے ۔

ان تمام افسانہ نگاروں کے علاوہ دوسرے اور افسانہ نگاروں نے بھی سماج کو اپنا موضوع بنایا ہے ۔ بہت کم تعداد ایسی ہے جو دیہات کے متعلق لکھتی ہے ۔ ان میں اکثر و بیشتر افسانہ نگاروں نے پریم چند سے فیض حاصل کیا ہے ۔ سماج کے معمولی معمولی واقعات کو صفحہ کاغذ پر لایا جا رہا ہے اور ان سے دوررس نتائج نکالے جا رہے ہیں اس سے ہندوستان کا بے حس معاشرہ بھی کروٹ لیتا نظر آتا ہے ۔ دیہاتی اور سماجی زندگی کے رموز و نکات کو پریم چند نے بہت تفصیل کے ساتھ آشکارا کیا ہے ۔ انکی کہانیوں میں کوئی تصنع اور نمود و نمایش نظر نہیں آتی ۔ وہ جو کچھ دیکھتے تھے لکھ دیتے تھے ان کا مطالعۂ زندگی اور مشاہدہ فطرت اتنا صحیح تھا کہ انھیں اس کے ثبوت کے لیے دلائل ڈھونڈھنے کی ضرورت نہیں پڑی ۔ ان کی شخصیت بھی نہایت شگفتہ تھی ۔ ان کے افسانوں نے اردو افسانہ نگاری

کی تاریخ میں انقلاب پیدا کر دیا۔ اور ہندوستانی افسانہ نگاروں کے رجحانات میں کافی تبدیلی پیدا کی اور انھیں اپنے ماحول، اپنے وطن، اپنے سماج اور اپنی سوسائٹی کا مطالعہ کرنا سکھایا۔ اور مشاہدہ کو بیان کرنے کی طاقت عطا کی۔ اس سے نہ صرف ہمارے سماج کو فائدہ پہنچا بلکہ ملک بھی نحوست کی بندشوں سے آزاد ہوتا جا رہا ہے۔ فقط

فہرست تصانیف منشی پریم چند

اردو افسانے

۱۔ سوز وطن و سیر درویش۔	افسانوں کی تعداد	۵	گیلانی الکٹرک پریس لاہور
۲۔ پریم پچیسی حصہ اول	" "	۱۳	دارالاشاعت پنجاب لاہور
۳۔ پریم پچیسی حصہ دوم	" "	۱۳	" "
۴۔ پریم بتیسی اول } ۵۔ " دوم }		۳۲	" "
۶۔ پریم چالیسی اول	"	۲۰	گیلانی الکٹرک پریس لاہور
۷۔ " دوم	"	۲۰	" "
۸۔ خواب و خیال	"	۱۴	" "
۹۔ خاک پروانہ	"	۷	" "
۱۰۔ فردوس خیال	"	۱۱	انڈین پریس الہ آباد
۱۱۔ دودھ کی قیمت	"	۹	عصمت بک ڈپو دہلی
۱۲۔ زادِ راہ	"	۱۲	حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی
۱۳۔ واردات	"	۱۳	جامعہ ملیہ دہلی
۱۴۔ نجات	"	۱۳	لاجپت رائے اینڈ سنس لاہور
۱۵۔ دیہات کے افسانے۔	شایع شدہ افسانوں کا انتخاب۔		دارالاشاعت پنجاب لاہور۔

اردو ناول

۱۔ ہم خرما و ہم ثواب		ہندوستانی پریس لکھنو
۲۔ روٹھی رانی		زمانہ پریس کانپور
۳۔ جلوۂ ایثار		انڈین پریس الہ آباد
۴۔ بازارِ حسن	دو جلدوں میں	دارالاشاعت پنجاب لاہور
۵۔ چوگان ہستی	"	"
۶۔ گوشۂ عافیت	"	"
۷۔ میدانِ عمل / بیوۂ مجاز	"	لاجپت رائے اینڈ سنس لاہور۔

۸ - نرملا ـ لاجپت رائے اینڈ سنس لاہور
۹ - غبن ـ دو جلدوں میں ـ سرسوتی پریس بنارس
۱۰ - بیوہ
۱۱ - میدان عمل ـ جامعہ ملیہ دہلی
۱۲ - گئو دان

اُردو ڈرامے

۱ - شب تار ـ زمانہ پریس کانپور
۲ - کربلا
۳ - روحانی شادی ـ عصمت بک ڈپو دہلی

ہندی افسانوں کی کتابیں

۱ - پریم دواشی
۲ - پریم پرتما
۳ - پریم تیرتھ
۴ - پریرنا
۵ - پانچ پھول
۶ - مان سروور دو جلدوں میں
۷ - کفن اور دوسرے افسانے
۸ - سپت سروج
۹ - پریم پچیسی
۱۰ - پریم پورنما
۱۱ - نو ندھی
۱۲ - پریم پرسون
۱۳ - اگنی سمادھ
۱۴ - سمر جاترا

ہندی ناول

۱ - سیوا سدن
۲ - پریم آشرم
۳ - بردان
۴ - پرنیا (پرتگیا)
۵ - رنگ بھومی - دو جلد
۶ - غبن
۷ - کرم بھومی
۸ - نرملا
۹ - کایا کلپ
۱۰ - گئودان
۱۱ - منگل سوتر

ہندی ڈرامے

۱ - کربلا
۲ - سنگرام
۳ - پریم کی ویدی

بچوں کے لیے

۱ - باکمالوں کے درشن
۲ - رام چرچا
۳ - کتے کی کہانی
۴ - جنگل کی کہانیاں
۵ - من مودک
۶ - شیخ سعدی
۷ - درگا داس

ہندی ترجمے اور تالیفیں

۱ - آزاد کتھا (فسانۂ آزاد کا خلاصہ)
۲ - چاندی کی ڈبیہ ⎫
۳ - ہڑتال ⎬ گالزوردی کے ڈرامے کے ترجمے
۴ - نیائے ⎭
۵ - آہنکار - اناطول فرانس کے ڈرامے کا ترجمہ
۶ - سکھ داس
۷ - ٹالسٹائے کی کہانیاں
۸ - پتا کے پتر پتری کے نام
۹ - نیرشٹی کا آرمبھ (تخلیق کائنات)
۱۰ - گلپ سموچیہ
۱۱ - گلپ رتن

اشاریہ